اے حمید

چائے والا



چائے والا

اے حمید

مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک اردو بازار ا

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

2006ء

اہتمام

ملک مقبول احمد

مقبول اکیڈمی

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

شید مقبول پریس، لاہور

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

میرے پیارے بچو
میں نے تمہیں چائے کی دکانوں میں دیکھا ہے
گاہکوں کے آگے چائے رکھتے
ان کی جھڑکیاں اور مالک کی گالیاں سنتے
میں نے تمہیں دکانوں کے پھٹوں پر سوتے دیکھا ہے
پھٹے ہوئے لحافوں میں ٹھٹھرتے
تمہیں کوئی بیڈروم نہ مل سکا
تم کسی ایچی سن کالج میں داخل نہ ہو سکے
صحرا کے پھول کی طرح تم پل بھر کو کھلے
اور جلتے سورج نے تمہیں جلا کر راکھ کر دیا

اے حمید

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

جاڑے کی رُت شروع ہوئی تو مجھے صوفی ہوٹل میں نوکری مل گئی۔

یہ ہوٹل شہر کے اندر بڑی گنجان آبادی میں واقع تھا۔ مکان ایک دوسرے میں گھسے ہوئے تھے۔ جن کی آڑھی ترچھی بوسیدہ منزلوں میں میلے کچیلے ستم ہائے روزگار کے شکار لوگ رہتے تھے۔ ان کے دل گردشِ زمانہ کے شکوہ شکایات سے بھرے رہتے اور ذرا سا موقع ملنے پر یہ کسی نہ کسی مصیبت کا رونا لے کر بیٹھ جاتے۔ یہ سب کے سب چھوٹے موٹے پیشہ ور اور معمولی معمولی نوکریاں کرنے والے تھے۔ بازار کے عین بیچ میں اوپر بجلی کے تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ جن میں پرانے چیتھڑے۔ گلے ہوئے پتنگ اور ڈوریوں کے میلے گچھے جابجا لٹک رہے تھے۔ سڑک ایک مدت سے مرمت طلب تھی۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے تھے۔ یہ اتنی چھوٹی تھی۔ کہ اس پر سے موٹریں نہ گزر سکتی تھیں صرف تانگے دھچکے کھاتے، گرتے پڑتے گزرا کرتے۔ برسات میں یہ کیچڑ سے بھر جاتی اور گھوڑوں کی ٹاپ کے ساتھ کیچڑ اڑ اڑ کر دکانداروں کی خبر لایا کرتا۔ یہ سڑک جنوب کی سمت شہر کے پرانے دروازے سے ہو کر باہر سرکلر روڈ سے جا ملتی تھی۔ رئیس لوگ اپنی اپنی موٹر کاروں کو اس دروازے باہر کھڑی کر کے اس گنجان علاقے میں کام دھندے کو آیا کرتے۔ یہ لوگ جب اپنے قیمتی کپڑوں میں ملبوس مانک شک سے آراستہ بھاری بھر کم وجود لیے ان دیمک لگے محلوں میں سے گزرتے تو ان پر غیر ملکی سیاحوں کا گمان ہوتا جو آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں کی سیر کو نکل آئے ہوں۔ مکانوں کی کھڑکیوں پر چقیں سداگری

رہتیں جنہیں برسات کی جھڑیوں اور جیٹھ، اساڑھ کی تیز دوپہروں نے مٹ میلا کر دیا تھا دوسری منزلوں کے بینگے ٹیڑھے چھجوں کے نیچے بیٹھے ہوئے کبوتر دن بھر غٹرغوں کیا کرتے۔ دیوار میں جہاں کہیں شگاف پڑتا وہاں چڑیا جھٹ سے گھونسلہ بنا کر انڈے دے دیتی۔ پیلے پیلے چہروں والے دُبلے پتلے یا پھُولی ہوئی توندوں والے بے روح لوگ صُبح سے شام تک ان بازاروں میں بڑی اکتاہٹ اور بیزاری کے عالم میں اِدھر سے اُدھر منڈلایا کرتے۔ کبھی اس دکان پر جا بیٹھتے اور کبھی اُس پر ڈیرہ جما دیتے۔ یہاں سے کھیر کھاتے وہاں گجریلے کا نوالہ لیتے اور پھر کہیں نان چھولوں پر ہاتھ صاف کرتے۔ میٹھا جاتے کچھ نہیں تو جوار بھنا کر ہی جیب میں رکھ لیتے۔ تینوں پہر ان کا منہ چلتا رہتا۔ کام تھوڑا کرتے اور جو کماتے انھیں اسی طرح کھانے پینے اور دوسرے الّلوں تلّلوں میں اڑا دیتے تھے۔ ان کی بیویاں دن بھر گھر کے کام میں جتی رہتیں۔ کھانا پکانا، سینا پرونا، کپڑے دھونا، دوسری منزلوں میں پانی بھرنا، سارے مکان میں جھاڑو پھیرنا، بچوں کو نہلانا دھلانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ عورتیں کولھو کے بیل کی مانند صُبح شام کام کے چکر میں پھنسی رہتیں۔ ان کے مرد روٹی رومال میں باندھ کر مُنہ اندھیرے کارخانوں، دکانوں یا دفتروں میں چھوٹی موٹی نوکریوں پر نکل جاتے۔ شام کو گھر آ کر مُنہ ہاتھ دھوتے، روٹی کھاتے، بچوں کو گھرکیاں دیتے، انھیں پیار کرتے، نمک کم ہونے پر بیوی کو بُرا بھلا کہتے۔ کھڑے ہو کر پانی کا گلاس چڑھاتے اور ڈکار مار کر محلے میں نکل آتے۔ پھر رات گئے تک یہ حجام کی دکانوں، حلوائیوں کی دکانوں، پنواڑیوں کی دکانوں اور ہوٹلوں کی گندی میزوں اور کھٹملوں سے بھرے ہوئے بنچوں اور کرسیوں پر بیٹھے دوستوں کے ساتھ چائے پیتے اور گپیں ہانکتے رہتے۔ رات کو اُٹھ کر گھر جاتے اور دن بھر کی تھکی ہاری بیویوں کی نیند حرام کر کے ان کا انجر پنجر ڈھیلا کر کے سو جاتے اور پھر صُبح کو اُٹھ کر کام پر روانہ ہو جاتے۔

ان کی زندگیاں لگی بندھی رفتار کے ساتھ روٹی، کام اور بیوی کے چکّر کے گرد گھوم رہی تھیں۔ یہ پرانی بیل گاڑی کا ٹوٹی پھوٹی سڑک پر دھچکوں سے بھرا ہوا سفر تھا۔ جس میں ماضی کا ملال۔ حال کی زبوں حالی اور مستقبل کا خوف سائے کی مانند ساتھ چل رہا تھا۔ کبھی کوئی

اچانک کسی نغمے کی تان اڑا دیتا تو اس دکھی سفر کی اداسی شگفتگی میں تبدیل ہوجاتی اور گھڑی دو گھڑی کے لئے مرجھائے ہوئے۔ پچکے ہوئے، بگڑے ہوئے چہروں پر رونق آجاتی خوش وقتی اور مسرت کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے اگرچہ ایک دوسرے سے بڑے دور دور واقع تھے تاہم ان کی وجہ سے اس طوفان خیز سمندر کا خوف کم ہوجاتا تھا۔

دکاندار دکانوں پر بیٹھے کاہلی سے پہلو بدلا کرتے یا گاہکوں سے نمٹنے کے بعد کوئی تاریخی ناول کھول کر بیٹھ جاتے۔ چھتوں پر لڑکیاں دیواروں سے لگی۔ منڈیروں پر کہنیاں ٹکائے گھنٹوں ایک دوسری سے مصروفِ گفتگو رہتیں۔ ان کی باتیں زیادہ تر نئے طرز کی قمیضوں سوئیٹروں کے نمونوں، فلمی گانوں، ہم جماعت سہیلیوں کی بے وفائیوں اور محلے کی دوسری لڑکیوں کی عشق بازیوں پر ہوتیں۔ گھروں میں یہ لڑکیاں سر جھاڑ منہ پہاڑ فقیرنیاں بنی کام کاج میں لگی رہتیں لیکن باہر بڑی بن سنور کر نکلتیں۔ عام طور پر سینما یا شادی بیاہ پر جاتے ہوئے یہ دوسری سہیلیوں کے گھروں میں جاکر پاؤڈر سرخی سے سنگار کرتیں بچا بچا کر جمع کئے ہوئے سارے پیسے یہ اپنے کپڑوں پر صرف کر دیتیں اور انارکلی میں دیکھے ہوئے فیشنوں میں یہ ایک دوسری پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتیں چلمنوں میں ان لڑکیوں کے زرد زرد چہرے بہت کم دکھائی دیتے۔ مگر جب کبھی بازار میں سے کوئی برات گزرتی یا کوئی ہنگامہ ہوتا تو چقیں اٹھا کر یہ ایک دوسری کے اوپر گر پڑتیں ان کی وجہ سے کئی باپوں کے سر سفید ہو رہے تھے۔ اور راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی لیکن یہ سکولوں میں چھٹی کے وقت اپنی سہیلیوں سے مل کر خوب قہقہے لگاتیں اور ایک دوسری سے ہنسی مذاق کیا کرتیں۔ ان پر اپنے باپ کے غم و آلام اور تفکرات کا بھید صرف اس وقت کھلتا جب کبھی یہ سکول سے ہنسی خوشی گھر آکر دیکھتیں کہ ان کا باپ ان کی ماں کی ٹھکائی کر رہا ہے۔ اور گھر میں سب بچے اپنی ماں کو پٹتے دیکھ کر رو رہے ہیں۔ اور ہنگامہ مچا ہوا ہے۔

صوفی ہوٹل انہی ہنگاموں کا ایک حصہ تھا۔ اس کے در و دیوار سے وہاں کے رہنے والوں کے خد و خال ہویدا تھے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینے سے معلوم ہوجاتا تھا کہ

وہاں کس قسم کے لوگ بیٹھتے ہیں چھوٹی سی جگہ میں زیادہ سے زیادہ کرسیاں اور میزیں ٹھونس دی گئی تھیں۔ دیواروں پر ایکٹرسوں کی تصویروں والے کیلنڈر آویزاں تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ دو تین کیبن بنے تھے۔ جس کی لمبوتری میزوں کے نیچے بوتلیں چھپا کر صوفی کے دوست شراب پیا کرتے تھے۔ عیاش لوگ یہاں اپنی متوالی معشوقاؤں کے پہلو میں بیٹھے چہلیں کیا کرتے۔ صوفی نے دیوار پر جلی حروف میں لکھوا رکھا تھا "یہاں شراب پینا، تھوکنا اور سیاسیات پر باتیں کرنا منع ہے۔"

لیکن لوگ وہاں شراب بھی پیتے، جگہ جگہ پان کھا کر تھوکتے اور سیاسیات پر بھی خوب باتیں کیا کرتے۔ صوفی مردہ آنکھوں، ڈھلکے ہوئے کلّوں والا ادھیڑ عمر کا تونددار انسان تھا۔ جو اگرچہ کسی زمانے میں بڑا نامی گرامی بدمعاش رہا تھا۔ لیکن اب چوہیا کی آہٹ سے بھی ڈر جایا کرتا۔ گدی پر بیٹھا وہ ران کے نیچے اپنا پاؤں دبائے ہاتھ سے ٹخنا کھجاتا رہتا کیونکہ وہاں اسے خارش نکل آئی تھی۔ جب غصے میں ہوتا تو چھوٹی چھوٹی مردہ آنکھیں باہر کو ابل آتیں۔ ہاتھی نما پلپلا بدن جوش میں کانپنے لگتا اور منہ سے جھاگ ٹپکنے لگتا۔ وہ بار بار مکا تان کر نوکروں پر برستا اور پھر سانڈ کی طرح بے دم ہو کر گدی پر گر پڑتا۔

دوسری منزل میں چند ایک کمرے تھے جہاں لوگ آکر رات کی رات ٹھہر جایا کرتے۔ ان کے لیے وہاں کھٹملوں سے بھری چارپائیاں اور بیماریوں کی پوٹ غلیظ چپ چپے لحاف اور نمدہ ایسے کھیس ــــــ ہر وقت موجود رہتے۔ ہوٹل کے ملازم وہاں آنے والے ہر مسافر کو اور ہر مسافر ان ملازموں کو مشتبہ انداز سے گھورنے کا عادی تھا۔ ان تنگ پھیکے ہوئے بدبودار کمروں میں سفیدیاں پچھلے کئی سالوں سے نہیں ہوئی تھیں چھتوں کی کڑیاں کالی پڑ گئی تھیں۔ دیواروں پر پان کی پیک کے نشان تھے۔ کونوں میں جالے لٹک رہے تھے۔ روشندانوں کے باہر چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ یہاں صرف ایک رات رہنے کے بعد انسان پر پوری زندگی کی کلفتیں اور مصائب آشکار ہو جاتے تھے۔ یہاں شب باشی کرنے والے عام طور پر مشتبہ لوگ ہوا کرتے۔ وہ رجسٹر میں غلط نام لکھواتے اور رات کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر شراب پینے اور فاحشہ عورتوں سے خرمستیاں کرتے۔ میں کبھی پانی کی بالٹی لے کر اوپر

جاتا تو ادھ کھلے کیواڑ میں سے دیکھتا کہ کہیں بوسہ بازی ہو رہی ہے اور کہیں شراب میں دھت کوئی متوالا بے سری راگنی الاپ رہا ہے۔ میں کمروں کے باہر دالان میں ایک طرف رکھے ہوئے بڑے حمام میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی الٹا دیتا۔ پھر کسی کمرے سے آواز آتی۔

"کیوں بھئی اس وقت گرم گرم کچوریاں مل جائیں گی۔؟"

میری عمر بمشکل بیس برس کی ہوگی۔ اس ہوٹل میں میرا کام منہ اندھیرے اٹھ کر انگیٹھیوں میں آگ سلگانا۔ پتھر کے کوئلوں کو توڑ کر انہیں ٹوکرے میں بھرنا۔ چائے کی کیتلیوں کو دھو مانجھ کر ان میں چائے کے لئے پانی رکھنا۔ کمرے میں جھاڑو دیتا۔ میزوں اور کرسیوں کو گیلے کپڑے سے پونچھنا اور پھر صبح سے شام تک گاہکوں کی خاطر داری کرنا تھا۔ اس کے عوض میں مجھے پچاس روپے ماہوار۔ صبح کا ناشتہ اور دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ میرے علاوہ ہوٹل میں دو اور بھی ملازم تھے۔ ہمیں دن میں صرف تین پیالی چائے پینے کی اجازت تھی۔ مگر ہم صوفی کی کڑی نگرانی کے باوجود کوئی نصف درجن چائے کی پیالیاں چڑھا جایا کرتے تھے۔ میں رات کو وہیں سوتا تھا۔ رات گئے جب فلم کا آخری شو دیکھ کر آنے والے گاہک بھی رخصت ہو جاتے تو میں پرانا کھیس اور پھٹا ہوا لحاف اوڑھ کر وہیں زمین پر ایک طرف پڑ رہتا۔

ہوٹل کے علاوہ مجھے صوفی کے گھر کا کام بھی کرنا پڑتا۔ ابھی گوشت لا رہا ہوں۔ ابھی صوفی کے چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔ گھر میں ان کی تیسری منزل پر پانی بھر رہا ہوں۔ صوفی کی بیوی ناٹے قد کی بھاری سی عورت تھی۔ جس کی آلو سی ناک چپٹے چہرے پر ٹکی تھی۔ چلتی تو یوں لگتا جیسے میدے کی بوری کو ٹانگیں مل گئی ہوں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی تو میرے سر پر ایسی دھپ مارتی کہ دن کو تارے نظر آجاتے۔ میں آٹھویں جماعت میں فیل ہو کر مختلف گھروں میں نوکریاں کرتا یہاں تک پہنچا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ اور رشتہ داروں نے گاؤں سے دیس نکالا دے دیا تھا۔ مجھے پڑھائی کا بڑا شوق تھا۔ لیکن یہاں اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی میں نے کچھ جاسوسی اور اسلامی ناول اپنے صندوق میں سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ جنہیں میں رات کو موم بتی کی روشنی میں زمین پر لیٹ کر پڑھا

کرتا۔ کیونکہ مجھے بجلی روشن کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ موم بتی کرسی پر چپ چاپ جل رہی ہوتی۔ میں لحاف میں گھُسا زمین پر لیٹا ہوتا۔ سر دیوار سے ٹکا ہوتا۔ ہاتھ میں میلا کچیلا پھٹا ہوا ناول ہوتا اور بڑے مزے سے پڑھ رہا ہوتا۔ کبھی کسی چابک دست جاسوس کے ساتھ قاتل کی ٹوہ میں راتوں کو اندھیرے گلی کوچوں کی سیر کیا کرتا اور کبھی اسلامی لشکر کے ساتھ دشمنوں پر حملہ آور ہو رہا ہوتا۔ ایک ہاتھ میں تلوار ہوتی، دوسرے سے گھوڑے کی باگیں تھام رکھی ہوتیں۔ نعرۂ تکبیر کے شور میں بجلی بن کر دشمنوں کی صفوں کو چیرتا کشتوں کے پشتے لگاتا دوسری طرف نکل جاتا۔ راتوں کو خواب دیکھتا کہ کسی ملک کا بادشاہ ہوں اور قیدی کفار کے لشکروں کو معاف کر رہا ہوں۔ وہ میری جے جے کار بلا رہے ہیں اور میں مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا مسکرا رہا ہوں۔ یا پھر یمن کا خوب صورت شہزادہ ہوں اور اپنی تاتاری محبوبہ کو گھوڑے پر لادے اپنے محلات کی طرف اڑا جا رہا ہوں۔ میرا شاہانہ لبادہ لہرا رہا ہے۔ دستار کی موتیوں جڑی کلغی ہوا میں اڑ رہی ہے۔ اور تاتاری محبوبہ کے خوشبو اڑاتے بال میرے شانوں کی بلائیں لے رہے ہیں۔ پھر اچانک ایک دھماکے کے ساتھ گھوڑا کسی تاریک کھڈ میں جا گرتا۔ میری آنکھ کھل جاتی پھٹے ہوئے لحاف میں سے ہڈیوں کو جما دینے والی ہوا اندر آ رہی ہوتی ٹھنڈے فرش نے میرا جسم سُن کر دیا ہوتا اور پاس ہی کونے میں پتھر کے کوئلوں کا ڈھیر پڑا ہوتا۔ میں جھرجھری لے کر پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ اس خیال سے کہ کولہو کے زخمی بیل ایسی اس تلخ زندگی سے بھاگ کر پل بھر کے لئے اپنی تاتاری محبوبہ کے بالوں کی خوشبو لے لوں۔ لیکن میری آنکھیں یوں درد کرنے لگتیں گویا ان میں پتھر کے کوئلوں کے ریزے پڑ گئے ہوں۔ پھر نہ تو اس دوشیزہ کا سراغ ملتا اور نہ ہی میری دستار کی کلغی میرے ہاتھ آتی۔

کسی وقت کوڈ سر پھر شراب کے نشے میں چور آدھی رات کو ہوٹل کا دروازہ دھڑ دھڑانے لگتا۔ میں آنکھیں ملتا اٹھ کر دروازہ کھولتا۔ وہ من موجی کسی آوارہ عورت کو پہلو میں دبوچے باہر کھڑا جھوم رہا ہوتا۔ اس کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی ہوتیں۔ بال ماتھے پر آئے ہوتے۔

"مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔ دروازہ کھولو۔"

عورت یونہی شرم وحیا کا نام رکھنے کو چہرے کے آگے نقاب کا پلو کر لیتی اور جسٹ پاک سے اوپر سیڑھیاں چڑھ جاتی۔ شرابی آدمی میرے قریب سے گزرتا تو جھک کر کان میں کہتا۔

"سوڈے کی دو بوتلیں اوپر دے جاتا۔ یہ لو ایک روپیہ کل تم بھی "ٹارزن کی واپسی" فلم دیکھ آنا۔ ارے مزہ آجائے گا۔"

میں ایک روپیہ جیب میں رکھ لیتا اور جب پانی سے بھرا ہوا جگ اوپرے کر جاتا تو دیکھتا کہ اس شرم وحیا کی پتلی نے کپڑے اتار رکھے ہیں اور وہ اپنے عاشق کی گود میں بیٹھی ہے۔ میز پر دو گلاسوں میں شراب پڑی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے بوس و کنار کر رہے ہیں۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اُوئی اللہ کہہ کر پرے ہٹ جاتی۔ شرابی عاشق اس کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارتا۔

"اری یہ تو اپنا یار ہے سالی! کیوں بے کیا خیال ہے؟ تمہارے لئے بھی ایک گلاس بناؤں؟ جنت کی کھڑکیاں کھل جائیں گی۔ خدا کی قسم......"

میں واپس ہوتا بغلی کمرے کی بتی روشن ہوتی اور کوئی گرجدار آواز میں دھاڑتا۔

"حرام زادی میرا سارا مال چٹ کر گئی اور اب آنکھیں دکھاتی ہے؟ میں بھی تیری ہڈی پسلی چبا کر چھوڑوں گا۔"

تیسرے کمرے میں کوئی نعرہ بلند کرتا۔

"ہٹ تیرے بجرے کی دم میں نمدہ۔ یہ رہی چرٹیے کی تکی"......"

میں نیچے آکر میزوں کے درمیان اپنے لحاف میں آکر گھس جاتا۔ فحش مناظر دیکھ لینے سے میرا خون گرم ہو رہا ہوتا کنپٹیاں بج رہی ہوتیں اور نیند کا نام و نشان باقی نہ رہا ہوتا۔ میں فوراً موم بتی روشن کرتا اور ناول کا ہیرو بن کر خیالی محبوباؤں کے سر اپنے قدموں پر جھکانا شروع کر دیتا۔ کبھی دمشق کے بازاروں میں امیر تاجر کے روپ میں اپنے ہیرے جواہرات سے لدے ہوئے اونٹوں کے ساتھ گزر رہا ہوتا۔ اور کبھی دشمنوں کی گردنیں قلم کرتا اپنی معشوقہ کے خیمے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوتا۔ اور کبھی کمند پھینک کر آدھی رات کو اس ہیبت ناک

قلعے کی پتھریلی دیوار پر چڑھ رہا ہوتا۔ جس کی دوسری جانب سنہری پردوں والی خواب گاہ میں ایک سیم تن شہزادی بے قراری سے میرے انتظار میں ٹہل رہی ہوتی۔

صوفی نے اگرچہ پولیس والوں سے خوب بنا کر رکھی ہوئی تھی پھر بھی کبھی کبھار یہاں چھاپہ پڑ جاتا۔ متوالے شرابی اور بدکار عورتیں ریوڑوں کی مانند ہنکا کر جیل خانے پہنچا دی جاتیں۔ رپورٹ درج ہوتی۔ ضمنی بھری جاتی۔ کچھ کی اسی وقت ضمانتیں ہو جاتیں۔ باقیوں کی سفارشیں پہنچ جاتیں۔ رشوتیں پہنچ جاتیں۔ کچھ بچ جاتے اور کچھ جیل چلے جاتے۔ صوفی اپنی گدی پر دم کٹے زخمی لومڑ کی طرح پھدک کر اپنے دشمنوں کو صلواتیں سنانی شروع کر دیتا

"میں ایک ایک کی خبر لوں گا۔ دشمن میرے ہوٹل کی مشہوری سے جلتے ہیں۔ وہ میرے ہوٹل کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی ایک ایک کی قرقی نہ کروائی تو صوفی نام نہیں۔"

نجو پہلوان حلوائی نے دہی کاٹ کر پیالے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"استغاثہ معاف صوفی یار تم ایک ہی رسے میں سب کو نہ باندھو۔ یہ تو کٹے بھرے کا معاملہ ہے۔"

صوفی نے ران پر ہاتھ مار کر کہا۔

"نجو پہلوان تم ان لوگوں کو نہیں جانتے جو میرے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ تم چپکے رہ کر دہی بیچتے جاؤ۔ اُن سے میں نپٹ لوں گا۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ صوفی کے اشارے اور اس کی مرضی سے ہوٹل میں ہر قسم کی بدکاری ہوتی تھی۔ جس قسم کا سفلہ پن اس دور کی سیاسی جماعتوں میں پایا جاتا تھا۔ اسی کا پرتو اس عہد کی عوامی زندگی میں بھی کم و بیش نمایاں تھا۔ جب بڑے سے بڑا سیاسی لیڈر خریدا جا سکتا ہو تو چھوٹے سے چھوٹے اہلکار کو رشوت دے کر کام نکلوا لینا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی۔

ہوٹل کے سامنے گورداسپوری اشٹام فروش کی دکان کے اوپر والے چوبارے پر ایک

شام کچھ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ان میں سے علیا نامی ٹپ گر کو نہ جانے کیا سوجھی کہ نشے میں جھومتا جھامتا بازار میں اتر آیا اور چوک میں کھڑے سنتری کے پاس جا کر بولا۔

"اوپر شرابیں اڑ رہی ہیں۔ ہی ہی ہی ....."

چوبارے کی کھڑکی سے لگا بختی مسنری یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اس نے وہیں سے آواز لگائی۔

"سنتری جی اسے بھی پکڑ لو۔ اس نے بھی پی رکھی ہے۔"

پولیس نے چھاپہ مار کر چوبارے میں بیٹھے ہوئے سب شرابیوں کو گرفتار کر لیا۔ جب انھیں ہتھکڑیاں ڈال کر حوالات لے جایا جا رہا تھا۔ تو علیئے ٹپ گر نے چیخ مار کر کہا

"یہ مجھے میری نیکی کی سزا ملی ہے۔ لوگو سُن لو۔ میں نے سچ بولا تھا اور اب حوالات کی سیر کروں گا۔ ارے لعنت ہے مجھ پر....."

کبھی کبھی جب سردی زیادہ ہوتی تو میں ہوٹل کے سب سے پچھلے کمرے میں جا کر دیوار کے ساتھ بنے ہوئے چبوترے پر چڑھ کر سو جاتا۔ یہ کمرہ چوڑائی میں تنگ اور پچکا ہوا تھا۔ اس کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جو دوسری طرف ایک تنگ و تاریک گلی میں کھلتی تھی۔ کھڑکی کھولو تو اُس طرف سے گندی اور نمدار ہوائیے بھپارے آنے لگتے۔ یوں لگتا جیسے ادھر گھوڑوں کے اصطبل ہیں۔ اس گلی میں ذرا آگے جا کر ایک تکیہ تھا۔ اس تکیئے میں ایک سوجے ہوئے چہرے اور پیتھرائی ہوئی آنکھوں والا جٹا دھاری فقیر چوری چھپے ضرورت مندوں میں چرس اور گھر کی کشید کی ہوئی شراب فروخت کیا کرتا تھا پہلی بار جب ایک گاہک کے لئے میں اس سے چرس کی گولی لینے گیا تو اس نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور پھر ریچھ کی طرح غرایا۔

"کیوں بے یہ قیدیوں کا حلیہ کیوں بنا رکھا ہے؟"

میرے سر کے بال ایک مدت سے ان دھوئے ہونے کی وجہ سے پھولے ہوئے تھے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں صوفی ہوٹل میں کام کرتا ہوں۔ اور "علینک" لینے آیا ہوں۔ ہوٹل میں بیٹھ کر چرس پینے والوں نے چرس کا نام "علینک" رکھ

چھوڑا تھا۔ جس کسی نے چرس پی ہوتی تو کہا جاتا۔
"اس نے عانیک لگا رکھی ہے۔"
ڈاکو کی صورت والے تکیئے کے درویش نے اپنے ہونٹ چبا کر کہا تمہارے حسب نسب سے میں پوری طرح واقف ہوں لونڈے وگرنہ یہاں آتے ہی تمہیں وہ پٹخنی دی ہوتی کہ نانی اماں یاد آجاتی۔
"لاؤ ہتھیلی ادھر کرو ـــــ پیسے لائے ہو؟"
چرس کی چھوٹی سی کالی گولی سگریٹ کے چاندی ایسے ورق میں لپیٹ کر اس نے میری ہتھیلی پر رکھ دی۔ میں جیب میں ڈال کر وہاں سے ہوٹل میں آگیا۔ پچھلی کوٹھڑی میں رات کو خوب محفل گرم ہوتی۔ یہاں بیٹھنے والے تقریباً سب کے سب چرس اور شراب کے رسیا تھے۔ یہ صوفی کے محلے دار تھے اور خاص الخاص یار تھے۔ ان کی نشست رات کے دس بجے شروع ہوتی اور رات ایک دو بجے تک جاری رہتی۔ اس محفل میں فقیرا نامی سٹے باز بیٹھتا جو خود بھوکوں مرتا تھا۔ لیکن اپنے پالے ہوئے دبنے کو نقرئی ورق میں لپیٹ کر بنارسی آملے اور گاجر مربّہ کھلاتا تھا۔
مستری لفرو بیٹھتا تھا۔ جو کمیٹی کے دفتر میں ملازم تھا۔ جس گھر میں پانی کا نل لگ رہا ہوتا یہ کمیٹی کے ہیڈ مستری کے ساتھ لوہے کے اوزاروں سے بھری ہوئی چھوٹی سی ریڑھی نما گاڑی ہانک کر وہاں پہنچ جاتا اور نالی کو لوہے کے شکنجے میں ڈال کر اس کے منہ پر چوڑیاں ڈالنے والا اوزار پھنسا کر اسے پوری قوت سے گھمانا شروع کر دیتا اس کی آنکھیں سدا چندھیائی رہتیں۔ داڑھی کے کرخت بال بڑھے رہتے چیچی انگلیوں میں بگلے کا سگریٹ تھام کر یہ ایک ہی کش میں تین چوتھائی سگریٹ جلا کر راکھ کر دیتا۔ یہ ایکٹریس نمی کا دیوانہ تھا۔ اور اپنی بیوی کو صرف اس لیے پیٹا کرتا کہ اس کی ناک نمی سے مختلف تھی۔ "خلیفہ نجو! یار نمی کبھی ہمارے میں نہیں آ سکتی؟"
اور پھر خود ہی کھی کھی کر کے ہنسنے لگتا اور پھر کھانسنے لگتا اور بڑھی ہوئی داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیر پھیر کر سانپ کی طرح پھنکاریں مارنی شروع کر دیتا۔ صوفی اسے چڑانے کے

لیے کہا کرتا۔

"نصرو! یار اس گکّو نے تمہاری نمّی کو ڈاؤن کر دیا ہے۔ سالی وہ مُجرا کرتی ہے۔ کہ پیسے کھرے ہو جاتے ہیں۔"

اس پر نصرو زور سے تھوک کر کہتا۔

"ارے گکّو کی ماں بہن کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نمّی نمّی ہی ہے۔"

پنساری شیھو دُبلا پتلا، ٹِنگنا اور چوڑے قد کاٹھ کا ہے۔ بڑا خاموش طبع آدمی ہے۔ وہ چرس کا سگریٹ پی کر گھٹ ہو کر بیٹھا رہتا ہے۔ اور اپنی لال لال آنکھوں سے بس ایک ہی طرف دیکھے چلا جاتا ہے۔ کسی وقت ایک آہ بھر کر بول اٹھتا ہے۔

"امرتسر کے کمپنی باغ میں جگنو بڑے ہوا کرتے تھے۔"

اتنا کہہ کر وہ کمبل اچھی طرح جسم پر لپیٹ کر پھر اپنے خیالات کی پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اچھا بجلی کبھی کبھار ہوٹل کی اس منڈلی میں نکل آتا۔ اسے تاش کی شعبدہ بازی میں کمال حاصل تھا۔ بڑا کائیاں شاطر تھا۔ جس میز پر وہ بیٹھا ہو۔ وہاں کوئی مال جیت کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس کا کام شہر کی کلبوں اور ایسے ہوٹلوں میں گھوم پھر کر اپنا رزق کمانا تھا۔ جہاں پولیس سے چوری چھپے جوا ہوتا ہو۔ اب وہ پتلون کوٹ پہننے لگا تھا۔ اور اپنے پرانے شہر والے دوستوں سے کم ملتا تھا۔ کبھی آتا تو اپنی بوسکی کی قمیض زین کی پتلون اور سیاہ پمپ شو سے ان لوگوں کی آنکھیں خیرہ کر کے چلتا بنتا۔

شیھو پنساری اس کا پرانا یار تھا۔ وہ اسے اکثر کہا کرتا۔

"شیھو میں اس دھوکے بازی کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں شریف لوگوں کی طرح گزر بسر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کروں تاش پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

دراصل اسے تاش کے دو ہاتھ دکھانے ہی سے اتنے پیسے مل جاتے تھے کہ وہ کسی محنت مشقت کا عادی نہیں رہا تھا۔ صبح سے شام تک ورکشاپ میں مشین کے سامنے اس کا پرزہ بن کر کام کرنا اب اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ تن آسانی اس کی ہڈیوں میں رچ گئی تھی۔ صرف ضمیر کی ایک ہلکی سی خلش تھی۔ جو کبھی کبھی اس کی

حرام کاری کی زندگی پر ملامت کیا کرتی۔ لیکن اس کا جسم اپنے ضمیر کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے جب جوا کھیلتے ہوئے تاش کے پتے اس کے ہاتھ میں ہوتے اور اس کی مکار چمکیلی نگاہیں گردوپیش کا جائزہ لے رہی ہوتیں تو وہ سب کچھ بھول جاتا۔

نکے بھیلے کو بدمعاش بننے کا بڑا شوق تھا۔ کمانی دار چاقو ہر وقت اپنی دھوتی کی ڈھب میں رکھتا اور چھوٹے سے چھوٹا امرود کاٹنے کے لیے بھی اسی چاقو کو کھولتا۔ پولیس والوں سے خواہ مخواہ کی واقفیت جتایا کرتا۔ کوٹھڑی میں آکر بدمعاشوں کی طرح ذرا کندھے جھکا آنکھیں ٹیڑھی کر چھاتی پھلا کر جائزہ لیتا اور گردن اکڑا کر کہتا۔

"پہلوان کل پھر تھانیدار نے بلایا اور کہنے لگا نکے بھیلے تمہاری ماں کو کیا کہوں اب تم میرے راج میں ہو محلے میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو سات سال کے لئے بند کروں گا۔ میں نے کہا۔ شاہ جی نوکر ہیں۔ ہم بدمعاش ضرور ہیں مگر محلے میں بالکل کھوتی ہیں۔ وہ کہنے لگا جا عیش کر۔ اور میں آگیا۔ وہ مجھ پر بڑا خوش ہے۔ اور اپنے منہ سے مجھے گالیاں دے رہا تھا۔"

پھر خوشی اور فخر سے اس کا منہ لال ہو جاتا اور گردن اور تن جاتی۔ اسے اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ تھانیدار نے اسے اتنی اہمیت کا بدمعاش سمجھا کہ اسے تھانے بلا کر تنبیہہ کی اور پھر اسے مخول مخول میں گالیاں بھی دیں۔ گالیاں تو اپنے یار ہی دیا کرتے ہیں۔ نکے بھیلے نے یہ واقعہ ہر ایک کو سنایا۔ محلے میں جہاں کہیں لڑائی جھگڑا ہوتا نکا بڑی آن بان کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا اور ہجوم کے بیچ میں کھڑا ہو کر دونوں فریقین کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتا پھر کسی بات پر جھنجھلا کر کہتا۔

"پہلوان محلے میں یہ دھونس نہیں چلے گی، ہمارے ہوتے ہوئے یہاں یہ بات نہ ہو سکے گی۔"

ایک روز مستری نصر دین نے اسے کہا۔

"بھیلے پتر! تمہیں بدمعاشی کا جو شوق چرایا ہے یہ تمہیں ایک نہ ایک دن جیل بھجوا کر

رہے گا۔"

اس پر نکے تھیلے نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"چیل مر جاتے ہیں۔ تمہاری ایسی کتیا تو نہیں جاتی۔"

جاکا رفوگر گھڑا بجانے اور گانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جب وہ چرس کا دم لگا کر گھڑے پر سر جھکا کر کوئی راگنی چھیڑتا تو صوفی ہوٹل کی اس پچھلی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے سر جھوم جاتے۔ جاکے کے تیل میں چپڑے گھنگھرالے بالوں کے لچھے اس کے ماتھے پر آجاتے۔ سونے کی انگوٹھیوں والے ہاتھ بڑی مہارت سے گھڑے کے پیندے اور منہ پر چل رہے ہوتے۔ چرس میں گھٹی ہوئی آنکھیں بند ہوتیں اور وہ گردن ایک طرف کئے چہرہ کندھے کے قریب لائے گا رہا ہوتا۔

شالا وگدی اے راوی وچ آیا بریتا
سانوں ایس جدائی دا کوئی چت دی نہ چیتیا
شالا چھڈگیوں کلی سیاڈا ہورا ای کیہڑا !!
سانوں لکھ وی نہ دیوے تیرا خالی ویہڑا

گیت کے درد انگیز بول اور جاکے رفوگر کی خشک جلی ہوئی آواز وہاں خواب آگیں سماں پیدا کر دیتی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اس تال سُر کے ساتھ گھڑا بجاتا کہ بیٹھے بیٹھے لوگوں کے جسم ادھر سے اُدھر جھومنے لگتے۔ کوئی بیچ بیچ میں ایک جھرجھری سی لے کر "یا علی" کا نعرہ لگا دیتا اور کوئی سر ہلاتے ہوئے اپنی ران بجانے لگتا۔ کوٹھڑی میں چرس کی بوجھل بوجھیلی ہوتی جسے تمباکو اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے تنفس کی بو مزید بوجھل بنا رہی ہوتی۔ میں ٹرے میں چائے کی دس گیارہ پیالیاں لگائے اندر داخل ہوتا تو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھتا۔ میں طشت زمین پر رکھ کر پیالیاں دری پر لگانے لگتا۔ اگر ذرا کوئی پیالی کھڑکھڑا جاتی اور اس سے شور پیدا ہوتا تو نکا تھیلا قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتا اور رفیق اسٹی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتا:

"شی"

نصرو مستری اس کے سر پہ دھپ مار کر بول اٹھتا :۔

"ماماجی تم تو چپ رہو۔"

نجو حلوائی کہنی مار کر چیختا ۔

"الو دیا پٹرا تو ہی باز آجا۔"

اور دیکھتے دیکھتے وہاں ایک دوسرے سے تو تکار شروع ہو جاتی اور رجا کارفوگر گھڑے پر ہاتھ روک لیتا۔ اس کے بعد وہاں چائے کا دور شروع ہو جاتا۔ چائے کے بعد جاکا رفوگر شیخو پنساری سے کہتا۔

"مولا ذرا رنگدار علینک ہو جائے۔"

شیخو بڑی خاموشی سے بگلے کے کچھ سگریٹ نکال کر چبوترے پر رکھ دیتا۔ ایک ایک کر کے وہ تمام سگریٹوں کا تمباکو نکال کر کاغذ پر جمع کر لیتا۔ پھر چرس کی گولی کو ماچس میں پھنسا کر آگ لگا دیتا۔ گولی ذرا گرم ہو جاتی تو اسے بجھا کر تمباکو میں رکھ دیتا اور پھر خوب اچھی طرح اسے تمباکو میں حل کر دیتا۔ اس کے بعد وہ اس کے باری باری سگریٹ بھرنے لگتا۔ جب سگریٹ تیار ہو جاتے تو انھیں بانٹ دیا جاتا۔ جو بھی چرس کا دم لگاتا اس بات کا خیال رکھتا کہ سگریٹ کا گل نہ جھڑنے پائے۔ کوٹھڑی دھوئیں سے بھر جاتی۔ نشہ آلود آنکھیں اس دھوئیں کی چادر میں انگاروں کی طرح دہکنے لگتیں۔ اس کے بعد پھر چائے کا دور چلتا۔ پان کھائے جاتے اور دلچسپ بے معنی باتوں کا وہ سلسلہ شروع ہو جاتا جو رات گئے تک جاری رہتا۔ یہ باتیں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق اور ٹھٹھا بازیوں سے شروع ہوتیں۔ ایک دوسرے کی کمزوری پہ پھبتیاں کسی جاتیں دلیپ کمار، مدھوبالا کے عشق کا تذکرہ شروع ہو جاتا۔ نصرو مستری کو ممی کے نام پر خوب رگیدا جاتا۔ یہاں سے بات لونڈے بازیوں کے نقصانات اور فوائد پہ اتر آتی اور سٹے بازی، جوا بازی، پہلوانوں کے دنگلوں، کرکٹ میچ اور فسادات سے ہوتی ہوئی پھر چرس بھرے سگرٹوں اور رجا کارفوگر کے مدھ بھرے گیتوں پہ آ کر ختم ہو جاتی۔ اس دوران میں اگر کوئی جمائی لیتا۔ تو اس کی شامت آجاتی۔ کوئی اونگھ جاتا تو اس پہ یہ جرمانہ لگتا کہ وہ

ناک پر انگلی رکھ کر سب کے سامنے نرت کرے۔

ان لوگوں میں طبیعتوں کا لاکھ اختلاف ہو لیکن ایک بات مشترک تھی۔ وہ سب کے سب خدا رسول کے نام سے کانپ جاتے تھے۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی۔ کہ وہ تین سال آبا دان یا کویت کے کارخانوں میں کام کر کے ڈھیروں روپیہ کما کر لائے اور پھر دو گھوڑا بوسکی کی قمیض پہن کر بھری کیپسل کا سگریٹ ہاتھ میں سلگا کر چوک میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومتا پھرے۔ سبھی دلیپ کمار کو پسند کرتے تھے۔ اور اسے بھارت کے ہر ایکٹر پر ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ وہ مسلمان تھا۔ اور ہندوؤں میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ لاکھ دنیا جہان کی بدکاریوں کے تذکرے کرتے لیکن میں نے ان میں سے کسی کو کبھی راہ چلتی کسی لڑکی پر آوازہ کستے یا اس کا پیچھا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ نکّا تھیلا جسے بدمعاشی کا بڑا شوق تھا۔ پرانے بدمعاشوں کی دیرینہ روایات کو زندہ رکھتے ہوئے اس بات کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ کہ محلے کی کسی لڑکی کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جائے۔ ہاں بدمعاش عورتوں کی یہ منڈلی بڑی رسیا تھی۔ اور وہ بھی غیر محلے کی ہوں۔ شریف بہو بیٹیوں کے سامنے ان کی آنکھ نہ اٹھتی۔ لیکن بدمعاش عورت کو یہ اس طرح مخاطب کرتے جیسے وہ کوئی مرد ہو۔ نکّے تھیلے نے اعلان کر رکھا تھا۔

"محلے کی ہر لڑکی ماں بہن ہے"

مجھے یقین تھا کہ اگر کبھی کوئی وقت آگیا تو یہ جوشیلا شخص محلے کی لڑکی کی عزت بچانے کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دے گا۔

جیرا بھوندو دبلا پتلا نوجوان تھا۔ جو اکبری منڈی میں باپ کے ساتھ اجناس کی آڑھت کیا کرتا۔ وہ بڑا ہتھ چھٹ لڑاکا اور جوشیلا تھا۔ اس کا بدن ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کو بے قرار رہتا۔ زبان کچھ نہ کچھ کہنے کو بے تاب رہتی۔ وہ پارے کی طرح ہوٹل اور بازار میں چکر لگایا کرتا۔ کوٹھڑی والی منڈلی میں کبھی جم کر نہ بیٹھتا اندر آتا چرس کا ایک آدھ کش لگاتا۔ جا کے رفوگر سے گھڑے پر گانے کے دو بول سنتا اور جب سب کو خاموش بت بن کر بیٹھے دیکھتا تو دانت کچکچاتا، انگلیاں چٹخاتا اٹھتا

بازو کھول کر ایک پوری جمائی لیتا اور پھر بیٹھ جاتا۔ گانا سننے میں مگن لوگ اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے۔ جیرا بھوندو لپ تے سر پہ زور سے چپت مار کر اٹھ کھڑا ہوتا۔

"کافر ہوں گا جو پھر ادھر آؤں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ باہر نکل جاتا اور گدی پر بیٹھے ہوئے صوفی سے کہتا۔

"صوفی صیب! یہ اندر گانا ہو رہا ہے یا پھیکے کنجر کے قل ہو رہے ہیں۔"

پھیکا کنجر اس کا حریف تھا۔ جو شروع شروع میں جیرے بھوندو کے مال پر ہیرا منڈی میں جا کر مجرا سنا کرتا تھا۔ اس نے جیرے کو الو بنا رکھا تھا اور یہ یقین دلایا ہوا تھا۔ کہ شمشاد نامی طوائف اس پر جان دیتی ہے۔ ادھر اس نے شمشاد کو پکا کر دیا تھا۔ چنانچہ دونوں مل کر جیرے بھوندو کے مال کا صفایا کر رہے تھے کہ نکّے تھلیلے نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس نے اپنی انصاف پسند بدمعاشی کی روایت نبھاتے ہوئے جیرے بھوندو کو سمجھایا۔

"پہلوان وہ کنجر تو تمہارا مال بکری کر رہا ہے۔ بھلا کبھی رنڈی کی ذات بھی کسی کی ہوتی ہے؟ کیوں اپنے باپ کی کمائی حرام کر رہے ہو؟ ہوش کے ناخن لو۔"

جیرا بھوندو جو ہمیشہ دوسرے کی باتوں میں آجاتا تھا۔ اس کی بات پر بھی فوراً ایمان لے آیا۔ اس نے اسی دن شام کو بھرے بازار میں پھیکے کنجر کو پکڑ لیا۔ دونوں طرف سے چاقو نکل آئے۔ اگر صوفی، فقیرا سٹی اور جاکا رفوگر بیچ میں نہ آتے تو وہاں دیکھتے دیکھتے ان دونوں میں سے ایک کی لاش تڑپ رہی ہوتی۔ اس کے بعد پھیکے کنجر نے صوفی کے ہوٹل میں آنا بند کر دیا۔ جیرا بھوندو ان لوگوں میں سے تھا۔ جو روپیہ ہتھیلی پر رکھے اس شخص کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ کوئی آکر انہیں بیوقوف بنائے اپنی شان دوبالا کرنے کے لیئے وہ اپنے ساتھ کسی نہ کسی ایسے شخص کو ضرور رکھتا جو اس کے ساتھ تانگے کی پچھلی نشست پہ بیٹھ کر ہیرا منڈی گانا سننے جاتا۔ اس کے سگرٹوں کا پیکٹ اور نوٹ میں سے باقی بچا ہوا کریانہ اپنے پاس رکھتا۔ اور

جس وقت جیرا بھوندو اشارہ کرتا وہ فوراً پنواڑی کی دکان کی طرف پان بندھوانے بھاگ جاتا۔ اس کے دوست اُسے ذرا سی شہ دے کر اس کی ذرا سی تعریف کر کے اس کے فوراً پانچ دس روپے خرچ کروا دیتے۔ اور جیرے بھوندو کو ذرا ملال نہ ہوتا۔ اس کے بدن میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ وہ کسی وقت خاموش اور نچلا نہ بیٹھتا۔ ایک روز بازار میں سے برات گزری تو جیرے کو اور کچھ نہ سوجھی تو چھاتی پھلا کر بازار میں آگیا اور جبڑے کھول کر بولا۔

"براتیں گزرتی ہیں۔ شادیاں ہوتی ہیں۔ ہٹ ترے ....."

ایک دن مستری نصرو نے آکر صوفی کو بتایا کہ مال روڈ پر ایک آدمی اس لڑکی کو اٹھا کر لے گیا جس کی پہلے اس سے منگنی ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں اس کے باپ نے محض روپے کے لالچ سے کسی دوسرے سے اس کا بیاہ کر دیا۔ جیرا بھوندو بھی وہاں بیٹھا تھا۔ اس نے سُنا تو جوش میں آکر بولا۔

"صوفی صیب! اگر میرا بس چلے تو عاشق و معشوق کو گلے ملاؤں جو نہ کرے اسے گولی سے اڑا دوں۔ ہیرا منڈی کو تہ تیغ کرا دوں۔"

عین اس وقت سامنے والی دکان پر سے گامی کباب فروش نے آواز لگائی

"بھوندو پہلوان رات والے کبابوں کے پیسے نہیں آئے۔"

بھوندو نے فوراً رُخ بدل کر کہا:۔

"تمہارے پیسے الٰہی مہر ہیں گامی۔ یہ لو۔"

اسد گنجہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ بازار میں ایک نانبائی کی دکان پر قلچے لگایا کرتا۔ اکیلی جان تھی۔ بال بچے سب امرتسر میں شہید ہو گئے تھے۔ دکان سے جو کچھ ملتا۔ اس کی شراب پی لیتا۔ شام کو ہر روز نشے میں ڈوبا رہتا۔ لڑکھڑاتا، کدوالیا سر ادھر اُدھر گھماتا کوٹھڑی میں داخل ہوتا اور ایک کونے میں ڈھیر ہو کر آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتا۔ پھر چونک کر سرخ سرخ دیدے نکال چاروں طرف گھورتا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش [illegible] رہا ہو۔ جس روز اس نے زیادہ پی ہوتی اور نشہ زیادہ چڑھا ہوتا تو کوٹھڑی

میں آکر ہر ایک کے پاس بیٹھ کر اپنے مرے ہوئے بال بچوں کی باتیں سنانے لگا۔

"کافروں نے ان معصوموں کو بھی شہید کر دیا۔ چھوٹا اگر زندہ ہوتا تو آج بارہ برس کا ہوتا۔ میں اسی دن اس کے لئے پھولدار نیکر خرید کر لایا تھا کہ پتہ چلا ظالموں نے میرے گھر کو آگ لگا دی ہے۔ وہ بھی مر گئے۔ ان کی ماں بھی ساتھ ہی جل مری ——— ہائے ———"

وہ پاگلوں کی طرح اپنے بچوں کے نام لے لے کر انہیں آوازیں دیتا۔ سر پہ دوہتڑیں مارتا۔ دیواروں سے ٹکراتا۔ بڑی مشکل سے اسے قابو میں کر کے وہیں سلا دیا جاتا۔ دوسرے دن وہ بالکل ہشاش بشاش اٹھ کر دکان پہ قلچے لگانے لگتا اور شام کو پھر شراب پی کر کوٹھڑی میں ادھم مچانے لگ جاتا۔ اس نے کوٹھڑی میں صاف صاف اعلان کر رکھا تھا۔

"دوستو! مجھ پر کبھی روپے پائی کا اعتبار نہ کرنا۔ مجھے جو کچھ دو گے میں اس کی شراب پی جاؤں گا۔"

حکیم سوختہ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے کسی دریائی گھوڑے سے کم نہ تھے پھولے ہوئے کلّے پچپٹے بے رنگ ہونٹ، گاجر سی ناک اور بڑھی ہوئی توند ——— جہاں بیٹھتے پھر اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ کرسی پہ بار بار پہلو بدلتے۔ ہنستے تو ٹھڈّی گردن کے ڈھلکے ہوئے گوشت میں چھپ جاتی۔ سرکاری سانڈ کی طرح ہر وقت زیادہ کھا جانے کی وجہ سے اپھرے اپھرے رہتے۔ حکمت میں معمولی شُد بُد تھی۔ مگر اپنی طبابت کا رشتہ حکیم بوعلی سینا سے ملاتے تھے۔ صوفی ہوٹل میں فاحشہ عورتوں کی آمد و رفت کے سخت خلاف تھے۔ لیکن جب کوئی عورت لیک کر ریشمی برقعہ لہراتی سیڑھیاں چڑھ جاتی تو اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہ جاتے۔ بڑے زمانہ ساز اور گرگ بداں دیدہ تھے۔ گھر میں دو بیویاں ڈال رکھی تھیں۔ اور تیسری بیوی کی ہوس دل میں تھی۔ اپنے مخالف کو خود کبھی کچھ نہ کہتے۔ بلکہ کسی دوسرے سے اس کی بے عزتی کروا دیتے۔ چہرے سے ہر وقت ہوس پرستی ٹپکا کرتی۔ جیسے بھوندو سے بدکار عورتوں کے قصے پہلے تو بڑے

مزے لے لے کر سنتے اور پھر کانوں پر ہاتھ رکھ کر توبہ استغفار کرنے لگتے۔ اس ساری منڈلی میں صرف یہی ایک شخص تھا جو مجھے سخت ناپسند تھا۔ لیکن مجھے مجبوراً اسے بھی چائے پیش کرنی پڑتی تھی۔ مجھے وہاں اس کی موجودگی بڑی کھلتی۔

ہمارے ہوٹل کا ہندوستانی باورچی بڑا بد دماغ تھا۔ ہر ایک سے تلخ کلامی کرتا ہر وقت جلا بھنا رہتا۔ گاہکوں نے صوفی سے کہا کہ وہ اسے جواب دے دے۔ مگر وہ چپکا ہو رہا۔ آخر جب باورچی کی بد کلامیاں انتہا کو پہنچ گئیں تو صوفی کے یار خاص فقر اسٹی نے کہا:۔

یار تم اسے جواب کیوں نہیں دے دیتے۔"

صوفی نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کیا کروں یار! ایسا باورچی مجھے پھر نہیں ملے گا۔ وہ دو دو دن کا باسی سالن گاہکوں کو کھلا دیتا ہے۔"

جیرے بھوندو کا باپ مر گیا تو وہ ایک دم نیک آدمی بن بیٹھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی اور پانچ وقت نماز شروع کر دی۔ کچھ عرصہ گزرنے پر اس نے نمازیں قضا کرنا شروع کر دیں۔ پھر داڑھی منڈوا ڈالی اور دیکھتے دیکھتے پھر وہی پہلے کا جیرا بھوندو اندر سے نکل آیا۔ حکیم سوختہ نے بڑے مولویانہ لہجے میں کہا:۔

"جیرے کیوں اپنی عاقبت خراب کر رہا ہے۔ اب تو تیرے لئے جنت کے دروازے بند ہو گئے۔ اب تمہاری بخشش نہیں ہو گی۔"

جیرے نے دانت کچکچا کر کہا:۔

"حکیم صیب! سب کو اپنی اپنی قبر میں جانا ہے۔ حشر کے دن آپ اپنی ایک نیکی بھی مجھے ادھار نہیں دیں گے۔ پھر آپ کو میری کیا پڑی ہے۔"

حکیم صاحب خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دیوار پر لگی ہوئی نور جہاں کی نیم عریاں تصویر کو گہری نگاہ سے دیکھا اور پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ڈکار لے کر کہا:۔

"یار جا کے! وہ نعت تو ذرا سنانا کیا تھی یار وہ ......"

شہر کے رئیس موٹر کاروں میں سوار ہو کر وہاں آتے۔ اپنی کاریں شہر کے پرانے دروازے سے باہر کھڑی کرتے۔ گامی کباب بیٹے کی دکان پہ آکر کباب خریدتے اور واپس اپنی کاروں میں جاکر انہیں شوق سے کھاتے۔ نصرو مستری جس کی شیو سدا بڑھی رہتی تھی۔ اور جس کی داڑھی مونڈھنے سے حجام صرف اس لئے پرہیز کرتے تھے۔ کہ استرے کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہوتا تھا۔ بگلے کا زوردار کش کھینچ کر بولا۔

"خواجہ جی کے لیں اگلے سال کویت چلا گیا۔ تو واپس آکر سارے پیسوں کی ایک کار خریدوں گا۔ پھر اسے دروازے کے باہر کھڑی کر کے خود کباب لینے یہاں آیا کروں گا۔ یار شیھو کار اس بازار کے اندر نہیں آسکتی؟"

شیھو پنساری جو کم گو تھا چرس کا دم لگا کر امرتسر کے کمپنی باغ کی سیر کر رہا تھا۔ اس نے سنا کہ کوئی اسے بلا رہا ہے۔ تو چونک کر بولا۔

"آتا ہوں۔ تم چلو......"

نصرو مستری نے اس کے سر پر دھپ جما کر کہا :۔

"اوے مریں کہاں جا رہے ہو؟"

شراب کے نشے میں دھت اسد گنجہ ایک رات صوفی ہوٹل سے باہر نکلا تو ترنگ میں دوسرے بازار کی طرف نکل گیا۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی چلا جا رہا تھا۔ اسد گنجے کو نہ جانے کیا سوجھی کہ جیب سے چاقو نکال کر اس کی پسلی پر رکھ دیا۔

"نکال دے بوڑھے جو کچھ جیب میں ہے۔"

بڈھا بھی بڑی پرانی ہڈی تھی۔ اس نے جیب دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی اور بولا :۔

"اس چاقو کو پسلیوں کے آرپار کر دو تو لے لو۔"

اتفاق سے وہاں ایک سپاہی آگیا۔ بڈھے نے شور مچا دیا۔ اسد گنجہ پکڑا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور چار سال کی سزا ہو گئی۔ حکیم سوختہ نے اس واقعے پر یوں تبصرہ کیا :۔

"برے کام کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے طب

کی رُو سے یہ جگر تباہ کرتی ہے اور اخلاقی اعتبار سے یہ انسانیت کا قلع قمع کرتی ہے۔ اسد گنجے کے ساتھ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہی تھا۔"

جانے کیوں میں اس دردمند کمزور و ناتواں سے دکھی انسان کو کبھی نہیں بھلا سکا۔ اس کے بعد کبھی کبھی میں رات کو موم بتی کرسی پر جلا کر جاسوسی ناول پڑھنے بیٹھتا تو رات کے سناٹے میں مجھے اسد گنجے کی دل دوز آوازیں سنائی دیتیں۔ یوں لگتا جیسے وہ جیل کی آہنی سلاخوں پر ہاتھ پھیلائے اپنے مرحوم بال بچوں کو آوازیں دے دے کر اپنے پاس بلا رہا ہے۔ جو اب کبھی اس دنیا میں اس کے پاس نہیں آسکتے تھے۔ شہر میں بھارتی فلم آن کی نمائش ہوئی تو مستری نفرو اور رنگے تھیلے نے ٹکٹوں کی بلیک سے خوب ہاتھ رنگے۔ رنگے نے تو بوسکی کی تین قمیضیں، ایک ریشمی تہمد اور دو جوڑی پمپ شو خرید لیے۔ نفرو نے ان پیسوں سے بال بچوں کے کپڑے بنوائے اور ایکٹرس نمی کی ایک بڑی تصویر شیشے میں فریم کروا کر گھر رکھ لی۔ جتنے روز شہر میں اس فلم کی نمائش جاری رہی نفرو بلا ناغہ کسی نہ کسی بات پر اپنی بیوی سے لڑتا جھگڑتا رہا اور کبھی کبھی اس کی ٹھکائی بھی کرتا رہا۔ کیونکہ اس فلم میں نمی نے کام کیا تھا۔ اور نفرو فلم دیکھنے ہر روز جاتا تھا۔ وہ لہک لہک کر ہوٹل میں نمی کے قصیدے سنایا کرتا۔

"یس جی نمی اگر اس فلم میں نہ ہوتی تو یہ ایک شو نہیں چل سکتی تھی
کیوں حکیم جی ؟"

حکیم مسکرا کر کہتا :۔

"بھئی تم تو اس کی تعریف کرو گے ہی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے
اس نے برا کام نہیں کیا۔"

جیرا بھوندو فوراً بول اٹھتا۔

"لیکن حکیم جی اگر دلیپ کمار نہ ہو تو فلم کوڑی کی نہیں تھی۔" جاکار قو کر کہتا۔

"پریم ناتھ کا نام کیوں نہیں لیتے ؟"

جیرا ہاتھ جھٹک کر کہتا :۔

"اوئے جا اوئے قیدیا! کہاں۔ ڈیپ اور کہاں پریم ناتھ"
جاکا ہنس کر کہتا :۔
"خدا کی قسم لڑائی والے سین میں پریم ناتھ کے سامنے تو وہ بالکل
چوہیا لگتا تھا۔"
جیرا گرجتا :۔
"زبان سنبھال کر بات کرو پہلوان۔"
جاکا بھی چمک اٹھتا :۔
"نہیں تو تم کیا میری ترقی کروا دو گے؟"
"یار چھوڑو تم لوگ آپس میں کیوں لال پیلے ہو رہے ہو۔"
حکیم سوختہ فوراً بیچ میں کود پڑتا۔ نجو پہلوان پینترا بدل کر کہتا :۔
"استغافی معاف حکیم صیب! یہ آن میں جو عورت مجرا کرتی ہے اس
نے تو گگو کی ماں کی بہن کی کر دیا ہے۔"
نصرو کہتا :۔
"ارے گگو پہلے کیا تھی؟"
"استغافی معاف! پہلوان نے 'عینک' تو نہیں لگا رکھی؟"
"یار تیرے سر میں تو بھوسہ بھرا ہے۔"
"کوئی بات نہیں پہلوان بھوسہ بھرا ہے ناں کوئی تمہاری طرح گندگی نہیں بھری ہوئی۔"
کھارے کا منہ کلہاڑے سے ملتا جلتا تھا۔ سر کے گنجان بال جھاڑو بنے رہتے۔
ہتھیلیاں لکڑ ہاروں ایسی چپٹی اور بھدی تھیں۔ وہ سردیوں میں کچی مچھلی یعنی کھگے اور
گرمیوں میں برف بیچتا۔ اس نے ایک دنبہ اور ایک خوب صورت لونڈا پال رکھا تھا
ان دونوں کی وہ بڑی ٹہل سیوا کرتا۔ جو کماتا انہی پر خرچ کر دیتا۔ دنبے کی پسلیوں پر اس
نے مہندی سے "پاکستان زندہ باد" لکھوا رکھا تھا۔ یہ خود ڈیڑھ پسلی کا آدمی تھا چھپائی
ہوئی بے رنگ آنکھوں سے ہر وقت پانی بہا کرتا۔ جسے بار بار دھوتی کے پلو سے پونچھا
کرتا۔ لونڈے کے بارے میں منڈلی کے لوگ اسے مذاق کرتے تو وہ ران پر ہاتھ مار کر کہتا

"ہم تو حسن پرست ہیں۔ پھول کو سونگھتے ہیں توڑتے نہیں۔"
نصرو مستری اسے چڑانے کے لئے بکرے کی آواز نکال کر کہتا:۔
"ہٹ کے بدھو۔"
کھارا فوراً ہاتھ اٹھا کر جواب دیتا۔
"ونٹ کٹنی۔"

کھارے کے دبنے کی چکی بڑی مجرّب اور جھول دار تھی۔ جو کوئی دیکھتا تعریف کئے بنا نہ رہتا۔ کھارے نے اعلان کر رکھا تھا کہ قربانی کے بعد یہ چکی صرف دوستوں میں بانٹی جائیگی
"خانہ خراب کے بیٹرو! چرس پی پی کر کلیجے جلا رہے ہو۔ چربی کھاؤ گے تو ہوش آجائے گی۔"

لیکن ہوا یہ کہ رات کوئی ستم ظریف کھارے کے دبنے کی چکّی کاٹ کرلے گیا۔ صبح دبنہ خون میں لت پت ادھ موا پڑا تھا۔ کھارا غصّے اور غم میں پھنکارتا اس کی دمچی پر جلا ہوا ٹاٹ رکھ کر کپڑا باندھ رہا تھا۔ اور چلا رہا تھا۔
"کوئی چور کے گھر میں سیندھ لگا گیا ہے، جس نے میرے دبنے کی دمچی کاٹی ہے میں اس کی انتڑیاں نکال کر چھوڑوں گا۔"
کسی نے کہا:۔
"بھئی اسے ہسپتال پہنچا دو۔ جانور کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔"
"خون بہت نکل گیا ہے۔"

دبنے کی آنکھوں میں سفیدی چھا رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ بند ہونے لگی تھیں۔ کھارے نے اسے اٹھا کر تانگے میں ڈالا۔ نصرو نے کہا:۔
"کھارے اسے ذبح کر دو۔ یہ نہیں بچے گا۔"
کھارا جوش کھا کر بولا:۔
"ذبح تو اسے کروں گا جس نے اس کی دمچی اڑائی ہے۔ یہ کیسے نہیں بچے گا۔"

مگر دینہ نہ بچ سکا۔ اس نے ہسپتال کے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔

جاڑے کا موسم رخصت ہو گیا تھا۔ اور اب خوش بہار کا زمانہ تھا۔ دن کو لوگ دھوپ اور چھاؤں کے سنگم پر چلنے لگے تھے۔ گرمیوں کی رت شروع ہوئی تو میں ہوٹل کے سامنے والی دکانوں کی کھلی چھت پر سونے لگا۔ چارپائی میرے نصیب میں نہیں تھی۔ چھت پر ایک پرانا ٹوٹا ہوا تخت پوش پڑا تھا جس کی پچھلی دونوں ٹانگیں علیحدہ ہو چکی تھیں۔ اینٹیں جوڑ کر میں نے اسے کھڑا کر لیا اور رات کو بغیر بستر کے وہیں پڑ رہتا۔ ہوٹل میں سارا دن اور شام کو بجلی کے پنکھے طوفانی گردش کے ساتھ چلا کرتے پچھلی تاریکی کوٹھڑی میں یار لوگوں کی بیٹھک اب بھی ہوتی۔ اتنا ضرور ہوا تھا۔ کہ دروازہ کھول کر آگے پردہ گرا دیا گیا تھا۔ اور عقبی کھڑکی کے پٹ کھلے رہتے۔ یہ گلی آگے تکیئے میں جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ اور یہاں بہت کم لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ ان لوگوں کو صرف یہی خطرہ رہتا کہ ادھر سے کوئی پولیس والا اندر نہ آدھمکے کیونکہ چرس کے بھبھکے اس کھڑکی کی راہ سے ہو کر دُور دُور کی خبر لاتے تھے۔ صوفی نے توند پر ہاتھ پھیر کر خارش زدہ ٹخنا کھجاتے ہوئے شیخو پنساری اور رجا کے رفوگر سے کہہ دیا تھا۔

"پہلوان ذرا چرس کے دُمکے، ڈاؤن کر دو اب"

ایک روز میں گلی والے تکیئے میں چائے کی کیتلی اور پیالیاں لے کر گیا تو جٹا دھاری درویش نے مجھے پاس بلا کر پوچھا:۔

"کیوں میاں تمہیں اس کام کے کتنے پیسے ملتے ہیں؟"

میں نے پورا حساب بتایا تو ابرو چڑھا کر حیرت سے بولا:۔

"ایں بس ——" پھر میرے کندھے پر جھک کر کہنے لگا۔"

"اور اگر تمہیں صرف ایک دن میں اتنی کمائی ہو جائے تو کیا خیال ہے؟ ایں؟"

"مجھے کام کیا کرنا ہو گا"

"ارے کام کیا ہو گا۔ بس پشاور تک جانا اور جو کچھ تمہیں وہاں سے دیا جائے اسے حفاظت سے لاہور لانا ہو گا۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ناجائز اشیاء کی سمگلنگ کے لئے مجھے آمادہ کر رہا ہے میں نے

صاف انکار کر دیا اور جٹا دھاری درویش کو اپنی طرف قہر بھری نگاہوں سے گھورتا چھوڑ کر واپس ہوٹل میں آگیا۔ اس کے بعد جب بھی میں چائے لے کر تکیئے میں جاتا یہ شخص بات بات پر مجھے پھٹکارا کرتا۔

عید مبارک کے موقع پر میں نے نئے کپڑے بنوائے تو کوئی ظالم میرا ٹین کا ٹرنک اٹھا کر لے گیا۔ اس میں میرے جاسوسی اور اسلامی ناول نئے کپڑے اور وہ رقم بھی تھی۔ جو میں نے ہر ماہ بچا بچا کر جمع کر رکھی تھی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میری ساری پونجی لٹ گئی تھی اب میرے پاس سوائے ایک میلی سی نیکر، آدھی آستین کے پھٹے ہوئے کرتے اور مرمت طلب چپل کے اور کچھ نہ تھا۔ صوفی نے پولیس میں رپورٹ درج کروا دی۔ اس نے مجھے کچھ بطور پیشگی پیسے بھی دیئے۔ میں نے لٹھے کا ایک پاجامہ اور پاپلین کی قمیض بنوالی یہی کپڑے پہن کر میں عید گاہ نماز پڑھنے گیا۔ واپس آکر میں نے کپڑے اتار کر پچھلی کوٹھڑی والی الماری میں رکھ دیئے اور وہی میلی کچیلی نیکر پہن کر ہوٹل کے کام میں جت گیا۔

ایک رات میں چھت پر لیٹا تھا۔ گرمی اور حبس کے مارے نیند نہیں آرہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ ساتھ والی دیوار سے سینک اٹھ رہا تھا۔ میرے قریب ہی نجو حلوائی چٹائی پر لنگوٹ باندھے چت لیٹا تھا۔ اور ایک مریخ سا مالشیا اس کے کسرتی بدن پر تیل کی مالش کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ہونکتا جا رہا تھا۔ نیند میری پلکوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ سامنے بینگی ٹیڑھی مکانوں کی منڈیروں کے اوپر گول گول زرد چاند نمودار ہو کر چمک رہا تھا۔ اور نجو پہلوان کے تیل میں چپڑے بدن کو بھی چمکا رہا تھا۔ مالش ختم کرنے کے بعد مالشئے نے اٹھ کر جمائی لی۔ چاند کی طرف منہ کر کے دھوتی کھول کر جھاڑی اور اسے دوبارہ باندھتے ہوئے تھوتھنی سیکڑ کر بولا۔

"پہلوان کچھ جل رہا ہے۔"

نجو حلوائی نے اپنے چربی چڑھے سینے پر ہاتھ مار کر کہا:۔

"عاشقوں کا سینہ جل رہا ہے پہلوان ۔"

اتنے میں بازار میں کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں نعرہ لگایا:۔

"ارے ہوٹل میں آگ لگ گئی ہے"

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ سامنے صوفی ہوٹل کے روشندانوں کی سلاخوں میں سے دھوئیں کے بادل باہر امڈ رہے تھے۔ اور کسی وقت ان میں گہرے سرخ شعلے کی زبان لہرا جاتی تھی۔ فوراً دروازہ توڑ دیا گیا۔ آگ کی ابتدا ہی تھی۔ چبوترے کی بھٹی میں کچھ انگارے بنا بجھے رہ گئے تھے وہاں سے بوریئے کے ایک کنارے نے آگ پکڑ لی اور دیکھتے دیکھتے گدی کے پیچھے دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی۔ کاٹھ کی الماری جلنا شروع ہو گئی۔ جس وقت ہم لوگ اندر پہنچے۔ یہ الماری شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور ہوٹل دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ بوریئے کے پاس ایک میز اور دو کرسیاں جل کر خاک ہو چکی تھیں اور اب شعلوں کی پیچ پیچ زبانیں دیوار کے ساتھ ہی ساتھ سانپ کی طرح لپٹتی چھت کے شہتیروں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں نے ٹب میں سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر اندر پھینکنا شروع کر دیں۔ سارا محلہ وہاں جمع ہو گیا تھا۔ سب دور دور سے احکامات دے رہے تھے۔ لیکن اندر کوئی نہیں جا رہا تھا۔ دکان کے اندر صرف میں کھڑا آگ پر پانی اچھال رہا تھا۔ صوفی بھاری بھرکم توند کو لیے پاگلوں کی طرح گردش کر رہا تھا۔ اور چیخ و پکار مچا رہا تھا جلتے ہوئے کاٹھ کے دیوار گیر کو میں نے لوہے کی سلاخ سے اکھیڑنا چاہا تو وہ دھڑام میرے اوپر آن گرا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ لیکن میری ٹانگ شعلوں میں جھلس گئی تھی۔ اور کھال ابلی ہوئی شکرقندی کے چھلکے کی یاد دلا رہی تھی۔ میں نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ اتنے میں وہاں آگ بجھانے والے ٹن ٹناٹن کا شور مچاتے ہوئے آن پہنچے اور آگ پر فوراً قابو پا لیا گیا۔

کچھ دنوں تو میری خوب تیمارداری ہوئی۔ صوفی خود مجھے تانگے میں بٹھلا کر ہسپتال لے گیا اور ٹانگ پر دوائی کا پلستر کروایا۔ شام کو مجھے روز گرم گرم دودھ پینے کو دیا جاتا۔ لیکن جب بیماری طول پکڑ گئی۔ تو مجھے ہوٹل کی دوسری منزل میں کمروں کے درمیان والے لان میں دیس نکالا دے دیا گیا۔ کمرے میں حمام کے پاس ایک جھلنگا سی چارپائی پر پڑا رہتا۔ گندے پانی کا نالہ میرے پاس ہی کھرے میں گرتا۔ جس کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگتا۔ گھٹنے سے ذرا اوپر تک ساری ٹانگ میلے کچیلے چیتھڑے میں لپٹی رہتی۔ زخموں میں انگور آ گیا تھا۔ مگر درد کے مارے ٹانگ ذرا نہ ہلا سکتا تھا۔ صبح چائے کی ایک پیالی کے ساتھ خشک ڈبل روٹی

لئے دو ٹکڑے مل جاتے۔ دوپہر کو بچی کھچی دو روٹیاں دال کے ساتھ اور رات کو بھی اسی قسم کی روکھی سوکھی مل جاتی۔ ہوٹل کے دوسرے ملازم بھی اب مجھے عضو معطل سمجھ کر مجھ سے بیزار ہو رہے تھے۔ وہ کام کاج کے سلسلے میں اوپر آتے تو میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے اب یہ ہوتا کہ وہ مجھے روٹی دینا بھی بھول جاتے۔ میں بھوکا وہیں پڑا رہتا اور کسی کو میرا دھیان نہ آتا۔ میرا بھی دل نہ مانتا اور نہ عزت گوارا کرتی کہ میں روٹی کے لئے چلا چلا کر ان لوگوں کو آوازیں دوں جن کے کان میری طرف سے بہرے ہو چکے تھے۔ کافی دیر بعد کوئی نہ کوئی اوپر آکر میرے سامنے روٹی ڈال جاتا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ کہ میں ان لوگوں کے ٹکڑوں پر کیوں بیٹھا ہوں۔ مگر جلی ہوئی ٹانگ کی وجہ سے مجبور تھا۔ کئی بار دل نے کہا اٹھ کر یہاں سے نکل چلو۔ لیکن ٹانگ نے ایک نہ مانی۔

ہوٹل میں قیام کرنے والے ہوائی پنچھی تھے۔ ان میں سے بیشتر صبح آتے اور رات کی رات گذار کر دوسرے دن رخصت ہو جاتے۔ انھیں میرے حال احوال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور نہ ان کے پاس اتنا وقت تھا۔ کہ وہ خواہ مخواہ اپنی قیمتی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر مجھ پر ضائع کرتے پھریں۔ دن کسی نہ کسی طرح گزر جاتا۔ مگر رات کاٹنی دو بھر ہو جاتی۔ یہ دالان مچھروں کی اقامت گاہ تھا اور یہاں ہوا کا بالکل گزر نہیں تھا۔ ساری رات مجھے مچھر کاٹتے رہتے اور میں کھجوری پنکھے سے اپنے آپ کو ہوا دے کر سلانے کی ناکام کوشش کیا کرتا۔ ایک رات مجھے سخت پیاس لگی۔ حمام بالکل خالی تھا۔ اس روز کسی نے اس میں پانی نہیں بھرا تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ سب لوگ سوئے ہوئے تھے ہوٹل بند ہو چکا تھا بازار میں بالکل سناٹا تھا صرف کسی وقت کوئی آدمی تیز تیز قدموں سے گزر جاتا۔ میں نے دو تین بار آوازیں دیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی نوکر دن بھر کے کام سے چور ہو کر بے سدھ سو رہے تھے میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور دیوار کا سہارا لے کر لنگڑی ٹانگ کو گھسیٹتا ابھی دو قدم ہی چلا تھا۔ کہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ درد کی ایک کربناک ٹیس اٹھی اور میرے منہ سے بے اختیار ہائے نکل گئی۔

عین اس وقت میرے بغل والے کمرے میں کسی نے بتی روشن کی۔ دروازہ کھلا

اور ایک کالی آنکھوں اور تر و تازہ چہرے والی دلکش لڑکی نمودار ہوئی ۔ اس نے مجھے بازو کا سہارا دے کر اٹھایا اور بولی :-

"تمہیں کیا چاہیئے ۔"

"پانی"

"ٹھہر دمیں لاتی ہوں ۔"

میں چارپائی پر آکر نیم دراز ہو گیا ۔ وہ لڑکی اندر گئی اور جب دوبارہ نمودار ہوئی ۔ تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا گلاس تھا ۔ اس وقت وہ مجھے رحمت کا فرشتہ معلوم ہوئی اس کے بال کھلے تھے ۔ اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے ۔ گوری رنگت پر نیند کا خمار تھا اور کالی آنکھوں میں بڑی دلفریب موہنی جھلک رہی تھی ۔

"تمہیں جس چیز کی ضرورت ہوا کرے مجھے آواز دے کر بلا لیا کرو ۔"

یہ لڑکی کل ہی ایک آدمی کے ساتھ آکر وہاں ٹھہری تھی ۔ اس کا آدمی صبح سے غائب تھا ۔ اور ابھی تک واپس ہوٹل میں نہیں آیا تھا ۔ اس کے بعد وہ عورت اکثر راتوں کو مجھے پانی پلانے میرے پاس آجاتی اور میری چارپائی پر بیٹھ کر مجھے پیاری پیاری باتیں سنایا کرتی ۔ دن بھر اس کے کمرے میں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ۔ اس کا اپنا آدمی کہیں فرار ہو چکا تھا ۔ اور اب ہر رات اس کے پاس ایک نیا آدمی آکر شب باش ہوتا ۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سوات کی رہنے والی ہے ۔ اور ایک آدمی اسے شادی کا لالچ دے کر اغوا کر کے وہاں سے لے آیا تھا ۔ اور اب اسے اکیلی چھوڑ کر فرار ہو گیا ہے ۔ در اصل وہ آدمی اس معصوم صورت لڑکی کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ کر چلا گیا تھا ۔

"میں اپنے پہاڑی گاؤں میں بکریاں چرایا کرتی تھی ۔ ہم لوگ بڑے غریب ہیں مگر اس غریبی میں بھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ اس آدمی نے آکر مجھے پھسلا لیا ۔ کہنے لگا میں تم پر جان دیتا ہوں ۔ میرے ساتھ شہر بھاگ چلو ۔ میں تمہیں اپنی رانی بناؤں گا ۔ اس نے مجھے زیور اور ریشمی کپڑے بھی لا کر دیئے ۔ میں اس کی باتوں میں آگئی اور اس کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلی ۔ اب وہ مجھے اس گناہ کے

جہنم میں جھونک کر خود بھاگ گیا ہے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس زندگی کا یہی انجام ہونا تھا۔"

میں نے کہا:۔

"تم پولیس والوں کو اطلاع کیوں نہیں کرتیں؟"

کہنے لگی:۔

"ڈرتی ہوں۔ اگر ایسا کیا تو مجھے چاقو مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے موت سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

اس واقعے کے ایک ہفتہ بعد ہوٹل میں ایک بڑا زبردست چھاپہ پڑا اور پولیس نے اس عورت کو اپنی تحویل میں لے کر اس کے کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ جب وہ پولیس والوں کی حفاظت میں کمرے سے باہر نکلی تو میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی:۔

"خدا حافظ —— مجھے یاد کیا کرو گے؟"

پھر میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر سیڑھیاں اتر گئی۔ مجھے یہ عورت بعد میں کئی بار خواب میں بھی نظر آئی۔ ایک بار میں نے اسے دیکھا کہ وہ پہاڑ کے دامن میں ایک پتھر پہ بیٹھی بھٹہ کھا رہی ہے۔ اور سامنے دھوپ میں سفید سفید بکریاں چر رہی ہیں۔ سوچتا ہوں کیا وہ درد مند دل والی بھولی بھالی لڑکی واپس اپنے گاؤں پہنچ گئی ہوگی؟

ایک ماہ بعد میں بالکل بھلا چنگا ہو گیا۔ اور ہوٹل میں کام کرنے لگا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ کولہو کے آگے آ کر جت گیا۔ برسات شروع ہو گئی تھی۔ برسات کی جھڑی لگتی۔ تو بازار میں پانی اتر تا نہ کئی روز تک کیچڑ پیچھا نہ چھوڑتا۔ پچھلی کوٹھڑی میں گرمی اور حبس کی وجہ سے اب رات کو محفلیں کم ہوا کرتیں۔ زیادہ تر یہ لوگ اب شام کو ہوٹل کے باہر کرسیاں اور چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتے اور وہیں اپنا موج میلہ کیا کرتے۔ ایک روز دوپہر کے بعد کالی گھٹا اٹھی اور موسم بے حد خوشگوار ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ سخت گرمی برداشت کرنے کے بعد لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ نخو حلوائی نے بازار میں کھڑے ہو کر بازو پھیلائے اور دھوتی جھاڑ کر بولا:۔

"واہ مولا تیرے رنگ۔"
کہیں سے کلوا بھنگی کا لونڈا ادھر آنکلا، یہ لونڈا فلمی گانے سنانے اور گگو کے ڈانس کی نقل اتارنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ ہوٹل کے باہر چارپائی اور کرسیوں پر صوفی ہوٹل کی منڈلی بیٹھی گپیں اڑا رہی تھی۔ نصرو مستری نے بھنگی لونڈے کو آواز دے کر پاس بلالیا۔

"چل بے ذرا ایک مجرا ہو جائے۔"

کھاے نے دانت کھول کر کہا۔

"اور گانا بھی خلیفہ۔"

تھوڑی دیر بعد جاکارفوگر میز آگے کھینچ کر اس پر ہاتھوں سے طبلہ بجا رہا تھا۔ جیرا بھوندو تال پیٹ رہا تھا اور کلوے بھنگی کا لونڈا بازار میں ڈانس کر رہا تھا۔ وہ ڈانس کم کر رہا تھا اور جسمانی کرتب زیادہ دکھا رہا تھا۔ کبھی وہ دونوں ہاتھوں کو پیچھے لے جاکر سر زمین سے لگا دیتا اور کبھی دائیں پہلو کو جھک کر ایک ٹانگ۔ اٹھا کر دائرے کی شکل میں چکر لگانے لگتا۔ طبلہ بجتا رہا۔ جیرا تالی بجاتا رہا۔ اور وہ بھنگی لڑکا ایسے خطرناک رقص میں مشغول رہا۔

صوفی ہوٹل کے چبوترے پر گدی پر بیٹھا ایک ہاتھ سے خارش زدہ ٹخنا کھجا رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے کریانہ گن کر گاہک کو دے رہا تھا۔ فقیرا سٹے باز چبوترے کی آڑ میں اندر کی طرف بورئیے پر بیٹھا گھسی پٹی پنسل سے کاغذ کی پرچیوں پر سٹہ لکھ رہا تھا۔ وہ بڑے مہمل انداز میں پرچیوں پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اتنے میں خیر دین لکڑی والے کے ٹال پر کام کرنے والے سجانی نے آکر پوچھا۔

"چچا آج منڈی کا کیا بھاؤ رہا؟"

"اٹھتی"

فقیرے نے اتنا کہہ کر چاروں طرف بڑے بڑے دیدے گھما کر دیکھ لیا۔ کہ کوئی سپاہی تو وہاں کھڑا نہیں سن رہا۔ سجانی نے آزردہ ہو کر کہا:۔

"یار اب کے حساب میں گڑبڑ ہو گئی۔ خیال تھا۔ بندی پڑے گی۔ چلو کل سہی۔ لاؤ صوفی جی ایک کوپ چائے۔"

فقیرے نے کہا :-

"پہلوان یہ تو قسمت کے کھیل ہیں۔ مال پانی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے"

سبحانی نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر فقیرے کی طرف لڑھکاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو پھر اکنی کی چھکی چونی کی بندی اور دونی کا منڈا پانچ لگا دو۔"

فقیرے کا پنسل بڑی تیزی سے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اور سیاہ حلقوں میں پھنسی ہوئی زرد آنکھیں سڑک پر ہر آنے جانے والے کو گھور رہی تھیں۔ معاً فقیرا چونک پڑا۔ "کالا آدمی، کالا آدمی آ" بازار میں ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اور کچھ پل کے لئے کلوا بھنگی کے نرت کار لونڈے کو ناچتے دیکھنے کے بعد آگے چل دیا۔ اس دوران میں فقیرے کے ہاتھ سے پنسل لڑھک کر چبوترے کے پہلو میں چلی گئی تھی۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ اور سبحانی نے مجرمانہ احساس کے ساتھ چائے کا کوپ ہاتھ میں پکڑے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ سپاہی جا چکا تو فقیرے کی پنسل پھر اسی تیزی سے چلنے لگی۔ سبحانی بھی اپنی اصل حالت پر آ گیا تھا۔ اور چسکیاں لے کر چائے پی رہا تھا۔

سبحانی کشمیری ہاتو تھا۔ اس کا سر درمیان سے گنجہ تھا اور کچھ اس بری طرح سے گنجہ تھا کہ یوں لگتا جیسے کوؤں نے پنجے مار کر زخمی کر رکھا ہو۔ دن بھر وہ خیر دین کے ٹال پر لکڑیوں کے کندھے کلہاڑے سے کاٹا کرتا اور رات کو وہیں سو رہتا۔ آج سے چھ سال پہلے وہ کشمیر سے ایک خوب صورت دلہن بیاہ کر ساتھ لایا تھا۔ اس نے مینڈھیاں کر رکھی تھیں اور گالوں پر خال کے نشان تھے۔ دو سال سبحانی کے پاس رہنے کے بعد وہ کشمیری چڑیل ایک قصائی لونڈے کے ساتھ بمبئی بھاگ گئی۔ آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ سبحانی نے شروع شروع میں اس کا بڑا غم کیا۔ لیکن بعد میں وہ اس بے وفا عورت کو بالکل بھول گیا۔

بازار میں چراغ چرسی گزرا تو کھارے۔ نے نعرہ لگا کر کہا :-

"بلاؤ چراغ چرسی کی ماں کو بھی"

چراغ چرسی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مری ماں کو بلانے کے لیے اپنی بہن کو بھیجنا کھا رہے ہے"
اور صوفی ہوٹل کے باہر بیٹھی منڈلی میں قہقہوں کا شور بلند ہونے لگا۔ کلوا بھنگی کا لونڈا اسی طرح ناچ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بدن پر گرد کے نشان پڑ گئے تھے۔ سبحانی نے چائے کا کوپ خالی کرتے ہوئے صوفی سے پوچھا :۔
"یار صوفی تمہارے بیٹے کا کیا ہوا پھر ؟"
"خراد کے کارخانے میں جاتا ہے اب تو"
"یہ تو تم نے بڑا اچھا کیا جو سکول سے اٹھا لیا۔ آج کل پڑھائی میں کیا رکھا ہے۔ کارخانے میں کام کرے گا۔ تو دو سال بعد کاریگر بن جائے گا۔ اور اپنی روزی خود کمایا کرے گا"
فیقا استٹی بیچ میں بولا :۔
"ہم نے تو صوفی کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے سکول مت بٹھلاؤ۔ یہ لڑکا پڑھائی نہیں کرے گا۔ اب سبحانی تم ہی بتاؤ۔ یہ جو بے چارہ صوفی منہ اندھیرے اٹھ کر ہوٹل کی گدی پر آکر بیٹھتا ہے۔ اور آدھی رات کو یہاں سے جاتا ہے تو آخر کس کے لیے !"
سبحانی نے فوراً کہا :۔
"اولاد کے لیے اور کس کے لیے"
"ہت تیرا بچہ جیئے ۔ اور جب پڑھائی اولاد کی جڑوں میں پانی پھیرنے لگے۔ تو پھر اس کا فائدہ کیا ؟"
اتنے میں باہر ایک شور مچ گیا۔ ہوا یہ کہ کلوا بھنگی کا لونڈا لوگوں کے بڑھاوے اور نشہ میں آکر کچھ زیادہ ہی نرت دکھانے لگا۔ اور اس کارستانی میں ایک بار جو پیچھے کو ذرا زیادہ جھکا تو گر پڑا اور بازو کی ہڈی تڑوا بیٹھا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اور درد سے کراہنے لگا۔ لوگوں نے فوراً اسے اٹھایا اور خدا بخش جراح کی دکان پر لے گئے۔ جس نے کچھ ایسے ہاتھ دکھلائے کہ غریب لونڈے کی چیخیں نکل گئیں۔

اب میرا دل اس چڑیا گھر سے بیزار ہوگیا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہوٹل کی نوکری چھوڑ کر کسی دوسری جگہ ڈیرا جمایا جائے۔ چنانچہ ایک روز جب میرے ایک یار نے جو شہر کے ایک، سینما گھر میں رنگ سازی کا کام کرتا تھا۔ مجھے آکر بتایا کہ ان کے سینما میں شاگرد پیشہ کی ایک جگہ خالی ہے۔ تو میں نے صوفی ہوٹل کو خیر باد کہا اور سینما گھر میں آکر ملازم ہوگیا۔

یہ سینما گھر شہر کی ایک خوب صورت اور بارونق سڑک پر واقع تھا۔

مجھے سینما گھر کے ہیڈ پینٹر نے اپنا شاگرد رکھ لیا۔ تیس روپے تنخواہ مقرر ہوئی اگرچہ یہاں صوفی ہوٹل کے مقابلے میں بیس روپوں کا خسارہ تھا۔ لیکن یہاں یہ لالچ بھی تھا کہ تین چار سال کے بعد میں کام سیکھ جاؤں گا اور مکمل کاریگر بن جاؤں گا۔ میرے یار کا نام پرسی تھا۔ وہ عیسائی تھا۔ اور لدھیانے کا رہنے والا تھا۔ سینما میں عرصہ تین سال سے کام کر رہا تھا۔ اور کافی کام سیکھ گیا تھا۔ اس کی تنخواہ بھی مجھ سے تیس روپے زیادہ تھی۔ ہم دونوں صبح آٹھ بجے سے شام سات بجے تک اپنے استاد کے ساتھ کام کرتے۔ ہمارے استاد نے سینما کے عقب میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ جہاں اس کے رنگ، بورڈ، برش اور دوسرا ساز و سامان بھرا رہتا تھا۔ سینما والے اسے تین سو روپے تنخواہ دیتے تھے۔ یہاں بیٹھ کر وہ باہر کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ ہمارے استاد کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ لیکن چہرے پر سدا نحوست برسا کرتی۔ نچلا جبڑا لٹکا رہتا۔ کام کرتے سمے یہ جبڑا زیادہ ہی لٹکنے لگتا۔ وہ امرتسر کا رہنے والا تھا۔ امرتسر میں وہ اپنے استاد کی لڑکی سے عشق لڑایا کرتا تھا۔ اور اب ایک شاگرد کی ماں پہ ڈورے ڈال رہا تھا۔ استاد عورتوں کا بڑا رسیا تھا۔ ہر بات کو ادھر ادھر سے گھما پھرا کر عورتوں کے تذکرے پر لے آنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ کبھی کبھی ایک ترکی ٹوپی پوش سوکھا ساکھا چمرخ سا نیم حکیم اس کے پاس آ نکلتا۔ اس نے استاد کو قوتِ مردمی کے اشتہار کے بورڈ بنوانے دے رکھے تھے۔ جو چھ ماہ گزر جانے پر بھی ابھی

تیار نہ ہوئے تھے۔ گجرات کا یہ نیم حکیم کمرے میں آتے ہی آلتی پالتی مار کر استاد کے سامنے تخت پوش پر آبیٹھتا اور گھٹنا بجا کر کہتا :۔

" بھائی حبیب! اگر بورڈ نہ بنے، میری دوائی کی مشہوری نہ ہوئی تو بتایئے میں قوتِ مردمی کی دوائی سانڈوں کی کھلاؤں گا؟"

ہمارا استاد پنسل سے گردن کھجاتے ہوئے بتیسی کھول کر کہتا :۔

" بادشاہو ناراض کیوں ہوتے ہو۔ ابھی تیار ہو جاتے ہیں۔ بورڈ لیکن کبھی یہ دوائی ہمیں بھی تو چکھایئے۔"

" آپ بورڈ بنا دیں میں ڈرم بھر کر دوائی لادوں گا"

استاد نیم حکیم کے سامنے بورڈ منگوا کر ان پر پرسی سے لکیریں ڈلواتا اور جب نیم حکیم خوش خوش واپس چلا جاتا تو استاد اس کے بورڈ پھر کباڑ خانے میں پھنکوا دیتا۔

" دیکھا سالو! کاروبار ایسے کیا کرتا۔ کام بھی نہ ہوا اور گاہک بھی خوش ہو گیا"

سینما کی مشین کا اپریٹر بالا چوڑا چکلا آدمی تھا۔ جو اونٹ کی طرح چلتا اور چلتے میں بھالو کی طرح بازو ہلایا کرتا۔ مشین کے اصلی کاربن بیچ کر نقلی کاربنوں سے مشین چلانا اس کا دل پسند شغل تھا۔ جب روشنی مدھم ہو جانے کی وجہ سے سینما ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ ہاہاکار مچا کر اسے گالیاں بکتے تو وہ دیوار کے سوراخ پر منہ رکھ کر گرجنے لگتا۔

" چلو تمہاری ماں .... تمہاری بہن ...."

جاڑے میں وہ موٹی لوئی اوڑھے رہتا اور گرمیوں میں دھوتی کرتہ پہنتا۔ وہ ایکٹریس شمّی کا عاشق زار تھا۔ اور اسے پیار سے ہفتنی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ کھیر بنا دوں گا" اس کا تکیہ کلام تھا۔ وہ استاد کے سر پہ دھپ مار کر کہتا :۔

" ہمت ترے رنگساز کی دم میں نمدہ۔ ماما جی ایک نہ ایک دن شمّی کے ساتھ مجھے تیری بھی کھیر بنانی پڑے گی۔"

استاد کا ایک بہنوئی تھا۔ جو دنیا میں صرف شطرنج کھیلنے، پیٹ بھر کر کھانا کھانے اور سوتے ہی آیا تھا۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اور ہمارا استاد اس کے گھر بار کا کفیل تھا۔

بوجھل اور آلکسی ادھیڑ عمر کا یہ ریچھ نما آدمی دن بھر استاد کی بیٹھک میں آکر بیٹھا رہتا اور اگر کوئی ساتھی نہ ملتا تو اکیلا ہی شطرنج کھیلا کرتا۔ اسے سیاسیات سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی وزیر کے خلاف باتیں کرتا رہتا۔ ایک دن نیم حکیم سے کہنے لگا:۔

"کیوں حکیم صیب! یہ گرانی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

استاد نے تنگ آکر کہا:۔

"ادئے تم جا چے لگتے ہو گرانی کے —— تم ہمارے پیچھے سی ڈی والوں کو لگا کر چھوڑو گے ماما جی۔"

گلو گیٹ کیپر بلیک کرنے، عورتوں کو پھانسنے اور دنگے فساد میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اس کے اندر طاقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دن میں ایک آدھ بار دھینگا مشتی نہ کرے تو اسے چین نہیں آتا تھا۔ ناک پر انگلی مار کر خون جاری کر دینا۔ اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ بچ موڑ توں، اس کا تکیۂ کلام تھا۔ جس روز سینما میں رش ہوتا وہ ٹکٹوں کی بلیک سے خوب ہاتھ رنگتا۔ بکنگ کلرک کے ساتھ مل کر وہ گیٹ پر تماشائیوں کو ٹکٹ کاٹ کر دینے کی بجائے اسے پورے کا پورا اپنے پاس رکھ لیتا اور دوبارہ فروخت کروا دیتا۔ اگر چیک کا خطرہ محسوس ہوتا تو وہیں سے بکنگ کلرک کو آواز دیتا:۔

"بچ موڑ توں لائے کی جان۔"

جس روز عورتوں کا شو ہوتا گلو کے پاؤ بارہ ہوتے۔ وہ گیٹ کا آدھا کیواڑ بند کر کے دروازے کے عین بیچ میں اس طرح کھڑا ہوتا کہ ہر عورت کو اس کے ساتھ لگ کر اندر جانا پڑتا۔ گلو نصف ٹکٹ عورت کو واپس تھماتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کی چھاتیوں تک لے جاتا۔ کبھی جھڑکیاں سنتا اور کبھی دلفریب مسکراہٹ اس کا خیر مقدم کرتی۔ اس روز وہ ایک نہ ایک عورت کو پھانس کر اسے بکس میں بٹھلا دیتا اور انٹرول کے بعد خود بھی وہاں پہنچ جاتا۔

تھرڈ کلاس کا گیٹ کیپر بلا ٹکٹ لوگوں کو اندر ہانک دیتا اور ان سے پیسے خود وصول کرنے کے بعد سینما کی مسجد میں نماز پڑھنے چل دیتا۔ اس کے ہاتھوں دوسرے گیٹ کیپر بڑے

تنگ آئے ہوئے تھے۔ کیونکہ اکثر اس کی کلاس سے لوگ جنگلا پھاند کر دوسرے درجوں میں آجاتے تھے۔ لیکن مولوی صاحب سے شکایت کی جاتی تو وہ توبہ کرنے لگتا۔

"خدا کو جان دینی ہے۔ بھائی۔ مجھ سے تو ایسی بے ایمانی نہیں ہوسکتی۔"

ہم دونوں رات کو سینما کے پچھواڑے ایک گلی میں سوتے۔ یہ ایک کٹڑی تھی۔ جہاں کتنی ہی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں۔ یہ کٹڑی سینما والوں کی ملکیت تھی۔ اور ان کا منشی ہر ماہ پانچ روپے فی کوٹھڑی کرایہ وصول کرنے وہاں آجاتا تھا۔ اسی کٹڑی میں ایک کوٹھڑی ہمیں بھی مل گئی تھی۔ یہاں میں اور میرا یار پرسی دونوں رہا کرتے۔ سیلی زمین اور نمدار دیواروں کی وجہ سے اندر بوسی پھیلی رہتی۔ چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف پرانے ٹوٹے پھوٹے بورڈوں اور کرسیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ ہم کھانا بلّے شاہ کے تندور پہ کھاتے اور چائے قلندر ہوٹل میں جاکر پیتے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی چارپائی تھی۔ جس پہ ہم باری باری سویا کرتے تھے۔

یہ کٹڑی بھی بھان متی کا کنبہ تھی۔

ہر کوٹھڑی کو ایک کچی دیوار الگ کرتی تھی۔ ہر کوٹھڑی کے آگے ایک چھوٹا سا کچا آنگن تھا۔ جہاں لوگ دھوپ میں کھاٹ ڈال کر بیٹھ جاتے۔ انہوں نے یہیں پاخانے بنائے ہوئے تھے آمنے سامنے بنی ہوئی ان ڈربہ نما کوٹھڑیوں کے درمیان ایک گندی نالی بہتی تھی۔ جو باہر جاکر بڑے نالے میں جاگرتی تھی۔ ہماری بغل والی کوٹھڑی میں ایک میراثی کنبہ رہائش پذیر تھا۔ دو عورتیں اور ایک نوجوان تیکھے نین نقش والی سانولی سلونی دبلی پتلی لڑکی۔ اس کی آنکھیں شربتی تھیں۔ اور کمر بڑی پتلی تھی۔ وہ چھوٹی سی ناک میں فیروزی رنگ کا لونگ پہنے رکھتی۔ ان عورتوں کا کام شادی بیاہ کی محفلوں میں راتوں کو جاگ کر گانا بجانا تھا۔

نھتی کا بڑا بھائی بھی اس کی ماں اور خالہ کے ساتھ اسی کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ یہ لڑکا بیماریوں کی پوٹ تھا۔ افیون کھاتا تھا۔ اور چرس پیتا تھا۔ شروع شروع میں شادیوں پہ بینڈ باجا بجانے والوں کی ٹولی میں کلارنٹ بجایا کرتا۔ لیکن نشے کی لت نے اس کا سینہ کھوکھلا کر دیا۔ دم باقی نہ رہا اور کام چھوٹ گیا۔ اب وہ کوئی کام وغیرہ نہ کرتا تھا

سارا دن کلارنٹ لیے شہر کے اندر ایک خفیہ چرس خانے میں بیٹھا رہتا اور نشہ کرنے والوں کی ٹہل سیوا کر کے خود بھی نشہ کر لیا کرتا۔ راتوں کو وہ بیشتر چرس خانوں اور تکیوں میں پڑا رہتا۔ دن میں کٹھڑی میں آتا تو گھر میں پڑا ہوا۔ کوئی نہ کوئی برتن بھانڈا اٹھا کر بھاگ جاتا۔ نھی کا باپ عرصہ ہوا مر چکا تھا۔ وہ تھیٹریکل کمپنیوں میں کلارنٹ بجایا کرتا تھا لیکن گانجے اور افیون نے اسے ہڈیوں کا ڈھیر بنا دیا اور چالیس برس کی عمر میں ہی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اُن دنوں نھی کی عمر نو دس برس کی ہو گی۔ اور وہ اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ شادی بیاہ والے گھروں میں جا کر کانسی کی دو پلڑوں والی گھنٹی بجایا کرتی تھی۔ مگر اب وہ عورتوں کی محفلوں میں ناچ بھی لیتی تھی۔ اس طرح انہیں ایک شادی پر پندرہ بیس روپے اور چاول گڑ چھوہارے اور ایک آدھ دوپٹہ شلوار وغیرہ مل جایا کرتی۔ میں کٹھڑی میں آتے ہی اس لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ سینما سے کسی نہ کسی بہانے کٹھڑی میں آ کر اسے دیکھ جایا کرتا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ کر کبھی کبھی مسکرا دیا کرتی۔ اور میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ راتوں کو میں خواب دیکھتا۔ کہ نھی میرے پاس بیٹھی مجھے گانا سنا رہی ہے۔ اور اپنی شربتی آنکھیں نیم دل کئے۔ مجھے پیار سے تکتی جا رہی ہے۔

اس سے اگلی کوٹھڑی میں ایک رکشا بان رہتا تھا۔

تیل چپڑے گھنگھرالے بالوں والا یہ دبلا پتلا سائیکل رکشا بان دلی کا مہاجر تھا پہلے کراچی میں رکشا چلاتا تھا۔ اب لاہور آ کر آباد ہو گیا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں بڑی بیٹی کے پاس دلی ہی میں رہتی تھی۔ یہ اس کٹھڑی میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ سارا سال رکشا بانی ویزا اور ہندوستانی کرنسی کے چکروں میں پھنسا رہتا۔ اپنی رکشا کو بڑا چمکا کر رکھتا۔ ہینڈل کے آگے اس نے لوہے کی چمکیلی سلاخ پر ایک آئینے کی ٹکڑی لگا رکھی تھی۔ صبح کام پر جانے سے پہلے وہ اسی آئینے کے سامنے جھک کر بالوں میں کنگھی کیا کرتا۔ جب کوئی اس کا دوست کوٹھڑی کے باہر کھڑے ہو کر اسے آواز دیتا۔

"کیوں فدن گئی پر ہو کیا؟"

تو رکشا بان فدن اندر ہی سے جواب دیتا

"آرہا ہوں میاں"

مدن اپنے بیوی بچوں سے بڑا پیار کرتا ہے۔ کبھی اس نے اپنی بیوی سے لڑائی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ راشن پانی سائیکل رکشا پہ لاد کر خود ہی لایا کرتا۔ اور کبھی کبھی دونوں بچوں اور بیوی کو رکشا میں بٹھا کر چڑیا گھر کی سیر کو بھی لے جایا کرتا۔ کٹڑی میں وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتا اور ہنس کر بات کرتا۔

اس سے اگلی کوٹھڑی میں چوک پراگداس امرتسر کی ایک مجذوبالحواس بڑھیا رہتی تھی۔ اس پستہ قد ہڈیوں کا ڈھیر بڑھیا کا جوان بیٹا فسادات میں مارا گیا تھا۔ لیکن اسے لوگوں نے یہی کہہ رکھا تھا۔ کہ وہ زندہ ہے۔ اور بھارت میں کسی جگہ اپنا دھندا کر رہا ہے۔ اب یہ عورت ہر روز ڈاکئے سے پوچھا کرتی۔

"میرے بیٹے کا کوئی خط آیا۔"

بوڑھا ڈاکیہ ہنس کر کہہ دیا کرتا۔

"نہیں ماں جی — شاید کل آجائے"

اور بڑھیا پُر امید نگاہوں سے اپنی پاش پاش ممتا کو دل میں دبائے کل کا انتظار کرنے لگتی۔ یہی انتظار اس کی زندگی تھی۔ وگرنہ وہ کب کی مر گئی ہوتی۔ لیکن اگر دھیان کیا جائے تو اس کی یہ زندگی ہزار بار کی موت سے بدتر اور المناک تھی۔ یہ بڑھیا اپنے داماد کے پاس رہتی تھی۔ جس نے پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کر رکھی تھی۔ دونوں میاں بیوی اس بڑھیا کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتے اور اسے بات بات پر جھڑکا کرتے

"اری کھوسٹ نہ تو مرتی ہے۔ اور نہ بستر چھوڑتی ہے"

بڑھیا سنی ان سنی کئے اپنی ہی دھن میں بڑبڑاتی رہتی۔

"میرے یاسین کا کل خط آئے گا۔ میں نے لاکھ منع کیا یاسین روٹی کھا کر باہر نکلنا۔ مگر مانا ہی نہیں۔ پھر حملہ ہو گیا۔ اب پردیس میں جا بیٹھا ہے۔ ماں کو بھلا دیا ہے۔ پر میں تو ماں ہوں۔ کل شاید خط آجائے۔ کل کپڑے اس کے تیار رکھوں گی۔ اس کے بالوں میں تیل کون لگاتا ہوگا؟۔ آئے گا۔ تو میں تیل لگا

کر اس کے بالوں میں خود کنگھی کروں گی۔ اسے روٹی کون پکا کر کھلاتا ہوگا ؟ ا
یاسین! ارے تم کہاں چلے گئے ؟"
بڑھیا کا داماد چھوٹے قد کا چوڑا چکلا گٹھے ہوئے بدن کا پن چکی نما آدمی تھا۔
وہ ایک پرائیویٹ بس کمپنی میں ڈرائیور تھا۔ شراب کا بڑا رسیا تھا۔ دوسرے تیسرے
نشے میں دھت کٹڑی میں آکر خوب ادھم مچایا کرتا۔ اناپ شناپ بکتا رہتا۔ جس دن زیادہ
چڑھی ہوتی۔ اس روز بیوی کی خوب ٹھکائی کرتا۔ جھلنگا چارپائی پر پڑی ہوئی بدنصیب
بڑھیا کو جھنجھوڑنے لگتا۔

"ماں! تیرا یاسین آگیا۔"

بڑھیا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔

"کہاں ہے میرا بچہ یاسین اوے یاسین! ہائے میرا پُتر! کہاں ہو تم"
بڑھیا دونوں ہاتھوں سے اپنے داماد کا سر تھام کر اس کی بلائیں لینے لگتی اور ڈرائیور
قہقہہ مارتا۔

"اری بڑھیا پاگل ہوگئی ہے؟ یہ تو میں ہوں۔ یاسین اب کہاں آئے گا؟
وہ تو اللہ میاں کے پاس بیٹھا ہے۔"

بڑھیا دونوں ہاتھ سینے پر مارتی اور داویلا کرنے لگتی۔ وہ باہیں پھیلا پھیلا کر یاسین
کا نام لے لے کر اپنے بچے کو پکارتی اور رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیتی۔ اس دوران میں
ڈرائیور اسے چھوڑ کر دلی والے رکشا بان کے پاس چارپائی پر جا بیٹھا ہوتا اور اسے جھوم جھوم
کر سنا رہا ہوتا۔

"قدرن بس اگلے سال میں اپنی گاڑی لے رہا ہوں۔ نوکری کی ماں کا ۔۔۔
اپنی گاڑی ہوگی۔ خود چلاؤں گا۔ اور عیش کروں گا۔ اس پینتیس بارہ سے
نجات ملے گی۔"

پینتیس بارہ اس کی گاڑی کا نمبر تھا۔ جسے وہ بس کمپنی کے نوکر کی حیثیت سے لاہور
سے گوجرانوالہ تک چلا رہا تھا۔ رکشا بان اپنے دونوں بچوں کو گود میں لیے بیٹھا ہوتا۔ وہ

ذرا نرمی سے کہتا :۔

"یار بڑھیا کو نہ ستایا کرو۔ وہ تو بے چاری پہلے ہی زندہ درگور ہے۔"

ڈرائیور آنکھیں مچمچا کر کہتا :۔

"فدن! تم نہیں جانتے۔ اس بڑھیا کا ڈینمو جل چکا ہے ——— چُسکی لگاؤ گے ؟"

رکشابان مسکرا کر انکار کرتا تو ڈرائیور اس کے کم سِن بچے کے پاس تھوتھنی لے جا کر پوچھتا۔

"کیوں میرے یار تمہارے لئے ایک گھونٹ بناؤں ؟"

شہر کے ایک علاقے میں آوارہ کتوں کی بہتات ہو گئی۔ تو کمیٹی نے اعلان کر دیا۔ جو کوئی کتے کی ایک ٹانگ لائے گا۔ اسے چار آنے انعام ملیں گے۔ لوگوں نے پیسوں کی خاطر آوارہ کتوں کی ٹانگوں کا صفایا شروع کر دیا۔ شرابی ڈرائیور نے لاہور، گوجرانوالے کے درمیاں کوئی کتا نہ چھوڑا۔ وہ جھولا اپنے ساتھ رکھتا۔ جہاں کہیں کتا دکھائی دیتا موٹر کھڑی کر کے چاقو لے کر اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتا۔ وہ کتے کی ٹانگوں سے بھرا ہوا جھولا لے کر کمیٹی کے دفتر جاتا اور شراب کی بوتل لیے گھر واپس آجاتا۔

کٹڑی کے بالکل وسط میں ایک پمپ لگا تھا۔ جہاں سے سب کوٹھڑیوں والے پانی بھرا کرتے۔ ننھی بھی بالٹی لے کر یہیں سے پانی بھرا کرتی پانی والے پمپ کے بالکل سامنے والی کوٹھڑی میں لال نامی خانساماں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ مریل سا دھنسی ہوئی آنکھوں اور پچکے گالوں والا ادھیڑ عمر کا آدمی جالندھر کا مہاجر تھا۔ اور کسی سرکاری افسر کی کوٹھی میں خانساماں تھا۔ اس کی سفید سفید بے رنگ آنکھوں کی پتلیاں بے حرکت رہتیں۔ اور جب ہنستا تو معلوم ہوتا کہ سامنے کے تین دانت غائب ہیں۔ وہ اپنے صاحب کے گھر سے چرا چرا کر ڈبل روٹی، مکھن، چینی اور بچوں کے لئے کیک بسکٹ لایا کرتا۔ فدن کے پاس بیٹھ کر وہ ان انگریزی افسروں کی قصیدہ خوانی شروع کر دیتا۔ جن کے ہاں وہ پہلے ملازم رہ چکا تھا۔

"فدن بھائی وہ زمانے ہوا ہو گئے۔ تمہاری قسم روٹی کی جگہ پیسٹری کھایا

کرتے تھے۔ پھر اگر ٹفن پسند آگیا تو صاحب بہادر نے خوش ہو کر وسکی کی پوری
بوتل انعام دے ڈالی۔ اب وہ زمانہ کہاں ہے۔

"اب تو بیگم صاحب پائی پائی کا حساب رکھوالیتی ہے ....."

وہ اپنے صاحب کے بنگلے پر ہوتا تو وہاں سے چرا چرا کر شراب کی چسکیاں لگا لیتا
لیکن نشہ ہمیشہ اسے بنگلے سے باہر نکل کر چڑھتا۔ اپنے صاحب کے حضور میں وہ بڑا
چاق و چوبند اور مستعد رہتا۔ مگر جونہی کٹڑی میں آنے کے لئے بنگلے سے باہر نکلتا نشے
میں جھومنے لگتا۔ اس کے پاس عبداللہ نامی ایک بڈھا کھوسٹ رہتا تھا۔ جس کی چندیا
پر ایک بال بھی نہیں تھا۔ اسے کم دکھائی دیتا تھا۔ اور ہمیشہ ایک پاؤں میں اپنا اور
دوسرے میں کسی اور کا جوتا پہنے ہوتا۔ یہ شخص کسی زمانے میں شہر کے ایک عالی شان ہوٹل
میں ہیڈ بیرا تھا۔ اور لوگوں کو مغربی شائستگی اور ادب کے ساتھ شراب پلایا کرتا۔ اس
کا چہرہ سدا سرخ رہا کرتا۔ اور رات کو بخشیش کی رقم سے اس کی جیبیں بھری ہوا کرتیں
لیکن اب وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اب وہ چمکیلی تھالی میں شراب کے جام لے کر خوش پوش
سرمایہ داروں کی میز تک چھپے تلے قدموں کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ اب اس کے
قدم بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے لڑکھڑاتے تھے۔ کبھی اس نے خوب صورت اجلی
وردی پہن رکھی ہوتی تھی۔ اب اس کے بدن پر میلے کچیلے چیتھڑے لٹکتے رہا کرتے۔ کبھی
وہ ہوٹلوں اور کلبوں میں خوش اندام خوب صورت اور نازک بدن عورتوں سے مسکرا مسکرا
کر باتیں کیا کرتا تھا اور اب اسے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ جس سڑک پر وہ چلتا وہ
پھیل کر ہزاروں میل لمبی ہو جاتی۔ جس آدمی سے وہ بات کرنا چاہتا وہ اسے دیکھ کر
اپنا راستہ تبدیل کر لیتا۔ ستر سال تک اپنی بھٹی میں مسلسل جلانے کے بعد زندگی نے اسے
راکھ کا ڈھیر بنا کر کٹڑی کے گندے نالے میں پھینک دیا تھا۔ جہاں ہوا کے ہر جھونکے
کے ساتھ اس کی خاک کے ذرّے اڑتے جا رہے تھے۔ اب اس کا کام یہ تھا کہ صبح
ہوتے ہی وہ اپنی ٹوٹی ہوئی عینک مردہ آنکھوں پر لگا کر اس کی ڈوری کان کے گرد لپیٹے
کر پھٹے ہوئے جوتوں کے ساتھ چیتھڑے لٹکائے افتاں و خیزاں کٹڑی سے باہر سڑک پر

نکل آتا اور فٹ پاتھ پر قدم قدم چلتے ہوئے ان عظیم الشان ہوٹلوں کے چکر لگانے شروع کر دیتا۔ جن کے شیشے لگے۔ قالینوں والے کمروں کے اندر وہ کبھی کمر کے گرد سنہری پٹکا باندھے گردن اکڑائے پھرا کرتا تھا۔ وہ ہر ہوٹل کے باہر جا کر سیڑھیوں پر چپ چاپ بیٹھ جاتا اور ہر آتے جاتے کو دیکھ کر یونہی مسکرا دیا کرتا۔ جو پرانے گاہک اُسے پہچان لیتے وہ اسے کچھ نہ کچھ بھیک میں دے دیا کرتے۔ کبھی ان ہوٹلوں کے باہر پان والوں اور سائیکل کے ٹھیکیداروں سے ـــ اس نے بات نہیں کی تھی۔ اب وہ ان کی جھڑکیاں سنا کرتا اور چپکا بیٹھا رہتا۔ ایک دن وہ اسی طرح کسی فٹ پاتھ پر چلتے چلتے یا کسی ہوٹل کے باہر بیٹھے بیٹھے لڑھک کر گر پڑے گا۔ اور مر جائے گا۔ اس کی آنکھیں پتھرا جائیں گی اور بھیک مانگنے کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جائیں گے۔ پھر تمام دکھوں، ذلتوں اور پچھتاؤں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر اُس طویل ناٹک کا پردہ گر پڑے گا جس کے ہر منظر میں لوگوں نے سیٹیاں بجائی تھیں۔ تالیاں پیٹی تھیں۔ تمسخر اڑایا تھا۔ جوتے پھینکے تھے اور گندے انڈوں کی بارش کی تھی۔ پھر کسی دوسری دنیا میں سٹیج لگے گا۔ بناؤ سنگار ہوگا۔ پردہ ایک بار پھر اٹھے گا اور کٹھ پتلیوں کا تماشا شروع ہو جائے گا۔

اس کٹڑی میں کبھی کبھی ایک پاگل جٹا دھاری آدمی آن وارد ہوتا۔ وہ ہر کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا کرتا۔ کوئی تکلیف تو نہیں؟ اب میرا راج ہے۔ میرے راج میں میری رعایا کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ بڑا بے ضرر دیوانہ تھا۔ ایک ہاتھ کا انگوٹھا چوستا رہا کرتا اور کہا کرتا :۔

"یہ سہارن پور کا آم ہے جسے میں چوس رہا ہوں"

کسی وقت بڑے جوش میں آ کر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا اور فدن یا لال نامی خانساماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا :۔

"تم میرے وزیرِ اعظم ہو۔ سب کو نمازیں پڑھواؤ۔ کسی کی ماں بہن کو میں بازار میں نہ دیکھوں۔ دکانیں کھلی رکھو۔ خوب مٹھائیاں بناؤ۔ کوئی جانور بھوکا نہ رہے۔ راتوں کو کتے بھونکتے ہیں۔ تو انہیں بھونکنے دو۔ میں بھی ایک کتا ہوں۔ عف عف

.....،، اس کے بعد وہ کُتے کی طرح بھونکتا اچھلتا کٹھڑی سے باہر نکل جاتا۔
کرنے والی کوٹھڑی میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ کٹھڑی کے باہر پیپل کے گنجان درخت تلے ایک چھوٹی سی مسجد بنی تھی۔ جس کے یہ امام تھے۔ داڑھی کے بال ڈالڈا گھی سے چمکایا کرتے تھے۔ آنکھوں میں کاجل لگا رہتا اور کندھے پر بسنتی رومال ڈال رکھتے کوٹھڑی کے آنگن میں بچوں کو دینیات اور اردو پڑھایا کرتے تھے۔ میلے کچیلے چیتھڑے لگے بچے چٹائی پر آلتی پالتی مارے بوسیدہ قاعدے گود میں رکھے سبق یاد کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہلا کرتے اور مولوی صاحب داڑھی کھجاتے بولا کرتے۔

"اس کا کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اب خدا کا خوف نہیں رہا اگر خدا کا خوف ہوتا تو ہماری مسجد کی ٹونٹیاں چوری نہ ہوتیں سمجھے؟ خوف کے نیچے نشان لگاؤ۔"

پھر وہ ایک طرف تھوتھنی اٹھا کر ذرا سی سیکڑتے اور چھڑی سے ٹنڈ منڈ لڑکے کا کندھا کھجا کر کہتے :۔

"کیوں اوئے چھیدے! آج تمہارے گھر کیا پکا ہے؟
تمہاری کوٹھڑی سے بڑے مسالوں کی خوشبو آ رہی ہے۔"

مولوی صاحب کبڑے تھے اور ان کا کوب چلنے میں بڑا نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ ایک روز دوپہر کو ہماری کوٹھڑی کے آگے سے گزرے تو پرسی نے سلام کر کے پوچھا :۔

"اس وقت مولبی جی کہاں جا رہے ہیں؟"

کبڑے مولوی نے کہا :۔

"ذرا مسجد میں کمر سیدھی کرنے جا رہا ہوں۔"

مولوی صاحب اکثر ہمیں نماز پڑھنے کی تلقین کیا کرتے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میرا یار پرسی عیسائی ہے۔ تو پینترا بدل کر بولے :۔

"اگر تم کسی روز مجھ سے مناظرہ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو میں تم پر ثابت کر دوں کہ اسلام میں جو خوبیاں ہیں۔ وہ کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہیں۔"

لیکن پرسی کے مناظرہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ تو عیسائیت کی خوبیوں کو بھی نہیں جانتا تھا۔ اور نہ ہی کبھی نماز پڑھنے گرجا گھر گیا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا۔ تو مجھے نہ تو نماز پڑھنی آتی تھی۔ اور نہ کبھی زندگی کے جھمیلوں نے اتنی فرصت ہی دی تھی۔ کہ مسجد میں جا کر خدا کا نام لیا جائے۔ مجھے تو خدا صرف ان دنوں یاد آتا جب میں تکلیف میں ہوتا۔ جن دنوں صوفی ہوٹل کی آگ میں میری ٹانگ جل گئی تھی۔ ان دنوں میں نے خدا کو بہت یاد کیا تھا۔ سردیوں کی رات کو جب کبھی ہم اپنی کوٹھڑی میں ہی دھواں کھائی پتیلی میں چائے بنا کر بیٹھے گپیں اڑا رہے ہوتے تو یہ کبڑا مولوی دروازہ کھول کر اندر آ جاتا۔

"واہ جی واہ! چائے پک رہی ہے! ارے نادانوں کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہو۔ اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کا لطف بھی اٹھاؤ اور اس کا شکر بھی ادا کر لیا کرو۔ یہ تو بتاؤ تم میٹھی چائے بنا رہے ہو یا نمکین؟"

پھر وہ ہماری کوٹھڑی میں بیٹھ کر چائے کی پوری تین پیالیاں خالی کرتا۔ اور ساتھ ساتھ ایسی باتیں سناتا رہتا جو ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہوتیں۔

"طریقت بھی اصل شریعت ہے اور شریعت بھی اصل طریقت ہے۔ پہلے دنیا میں طریقت پیدا ہوئی۔ پھر شریعت بنی۔ معرفت کا دریا بہہ رہا ہے ارے کچھ کر لو نوجوانو! ......"

پھر وہ آگے جھک کر پراسرار لہجے میں کہتا۔ اس کی گول گول آنکھیں لالٹین کی روشنی میں کسی جن کی آنکھیں معلوم ہونے لگتیں۔

"لونڈو ذرا اس ننھی میراثن سے خبردار رہنا۔ بڑی نٹ کھٹ لونڈیا ہے اچھا یار میں نے سنا ہے یہ فدّن سے لگی ہوئی ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میرا خون کھولنے لگتا۔ میرا جی چاہتا کہ اس کبڑے مولوی کا منہ نوچ لوں میں پیچ و تاب کھانے لگتا اور پرسی جو میرے عشق سے واقف تھا۔ منہ لٹکا کر کہتا۔

"مولبی جی ہمیں تو کچھ پتہ نہیں اور نہ ہمیں ان باتوں سے کوئی سرکار ہے۔"

مولوی نے بڑے خریفانہ انداز میں پرسی کی ران پر ہاتھ پھیر کر کہا:۔

"تمہیں محلے کی لڑکیوں کا پورا خیال رکھنا چاہیئے۔ کیا تم مرد نہیں ہو؟ ارے یہ چاپینی چھوڑ دو۔ سبحان اللہ! انکھی کی آنکھوں میں تو خدا کی شان نظر آتی ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے پرسی کو صاف صاف کہہ دیا کہ اگر یہ مولوی پھر یہاں آیا تو میں دو میری مار کر اس کا کوب دو ٹکڑے کر دوں گا۔

ابراہیم نامی مستری سب سے آخر والی کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ وہ یہاں اکیلا رہتا اور ہر ماہ گجرات میں اپنی ماں کو پچاس روپے کا منی آرڈر بھیجا کرتا تھا۔ وہ لوکو شاپ میں ملازم تھا۔ اور منہ اندھیرے ہی ورکشاپ کے گھگھو کی آواز پر کوٹھڑی سے نکل جاتا۔ اکہرے بدن اور مڑی ہوئی ناک والا یہ نوجوان فلموں کا بہت شوقین تھا۔ اس نے ایک کاپی بنا رکھی تھی۔ وہ جو فلم دیکھ کر آتا اس کا اس میں اندراج کر دیتا۔ کون سی فلم تھی؟ ہیرو کون تھا؟ نمونہ کس کا دکھایا گیا اور کتنا رش تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ پرسی سے اس کا بڑا یارانہ تھا۔ پرسی اسے سینما کے پاس لا کر دیا کرتا تھا۔ ابراہیم کی کوٹھڑی سے رات کو اکثر تازہ فلموں کے گیت گنگنانے کی آواز آیا کرتی۔ اپنی باتوں میں وہ جز کا لفظ بہت زیادہ استعمال کیا کرتا۔

"اب تو لوگوں نے ہر شے کا جز ڈھونڈھ لیا ہے۔ پرسی مثلاً آٹے کا جز بھُوسا۔ مرچوں کا جز پیسی ہوئی اینٹیں اور چائے کا جز کیکر کی چھال۔ اب تو موت کا بھی کوئی جز تلاش کرنا چاہیئے۔"

بعض اوقات وہ کچھ اپنے لفظ استعمال کیا کرتا۔ وہ یہ لفظ خود ہی بنا لیا کرتا تھا۔ یہ الفاظ اس کے جملوں میں نمودار ہو کر معنی خیز بن جاتے لیکن اگر انہیں الگ کر کے دیکھا جاتا تو بڑے بے معنی محسوس ہوتے۔ مثلاً وہ کہتا:-

"ہمارا فورمین بڑا ادھڑن دھڑن آدمی ہے — بڑا اتر دھانگ مکان تھا یار وہ تو — میں کہتا ہوں تم اس خدا کے بندے کی باتوں کا آپس میں کوئی جائینٹ نہیں لگا سکتے۔ پرسی یار اس کے بعد تو وہ بڑا اشٹی فین ہو گیا اور کیا مجال جو کبھی کوئی ہنتھو خیری بات کہی ہو۔"

سیاسی لوگوں سے بڑا بے زار تھا۔ اور اس کے خیال میں ووٹ بازی دُنیا کا سب سے

بُرا کام تھا۔

" یہ بھی سیاست کا جزو ہے۔ اس طرح تم دس غنڈے ہے کر ایک بڑے غنڈے کو چن لیتے ہو۔ اور وہ پھر دھڑن دھڑن ساری قوم کے کابلے ڈھیلے کرنے شروع کر دیتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں ایک ایسا انقلاب آئے کہ ان سیاسی غنڈوں کو اشٹی فین کر دیا جائے۔ ان کا سارا جز نکال لیا جائے۔"

پھر بات پلٹ کر پرسی سے پوچھتا:۔

" سنا ہے یار تمہارے منڈوے میں "سیمسن اینڈ ڈلائی لالہ" فلم لگ رہی ہے ؟"

کبھی کبھی ہمارے سینما کا سلائیڈیں چلانے والا ہماری کوٹھڑی میں پرسی کے ساتھ شراب پینے آیا کرتا۔ وہ اپنی شراب کی بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتا۔

" سکھ فوجی نے کہا میں بوتل ایک ہی سانس میں چڑھا لیتا ہوں۔ میں نے بوتل سامنے لا کر رکھ دی۔ سردار صاحب نے پاؤ بھر بھی نہیں پی تھی کہ تختہ ہو گئے۔ اس کے سامنے میں بوتل چڑھا گیا اور کیا مجال جو پاؤں لڑکھڑائے ہوں۔"

لیکن ہمیشہ ہوتا یہ کہ پرسی اور سلائیڈمین شراب پینے بیٹھتے۔ سلائیڈمین چوتھے جام پر گریبان پھاڑ کر چوکیداروں اور سینما کے مالکوں کو گالیاں دیتا کوٹھڑی سے باہر نکل جاتا اور پرسی بڑے مزے سے باقی شراب ہضم کر جاتا اور گھٹ ہو کر پڑا رہتا۔

رکھیا نامی ادھیڑ عمر کا مصلی سینما کے تماشتی جلوس میں ڈھول پیٹنے والے کے ساتھ گھنٹی بجایا کرتا تھا۔ اسے چرس کی لت پڑی ہوئی تھی اور سینما کے ہر آدمی سے وقت بے وقت پیسے مانگا کرتا۔ پرسی نے لنڈے سے ایک کوٹ خریدا تو اس کی تعریف کرتے ہوئے رکھیا بولا:۔

" اتنے ایل نمبر کوٹ میں ایک جوتی میرے لئے ضرور ہونی چاہیئے۔"

ایک روز مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا:۔

"بڑے ٹھنڈے ہاتھ ہیں۔ ضرور آئس کریم کھائی ہوگی۔ کیا مجھے نقل کرواؤگے؟"
ایک روز چرس کے نشے میں گھٹ ہوکر ہماری کوٹھڑی میں آگیا اور بے پر کی باتیں بنانے لگا۔

"کراچی میں ایک روز پیٹرول والے اگن بوٹ پر سیر کو نکلا تو بیچ سمندر میں ایک مچھلی نے تڑپ کر غوطہ لگایا اور دوسری بار جو ابھری تو میری گود میں تھی۔ میں نے کہا بڑی بی یہاں کیا لینے آئی ہو خدا کی قدرت سے پانی میں کیسے کیسے جو ر ہتے ہیں۔ رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بڑے بڑے پر نکل آئے ہیں۔ اڑا جا رہا ہوں۔ پیچھے ایک جن لگا ہے۔ وہ چھنکاریں مار رہا ہے۔ پھر ایک ملک میں آگیا۔ کسی نے کہا یہ ملک چین ہے۔ بادشاہ یہاں کا مہربان ہے اور آنے والے کی خاطر تواضع کرتا ہے۔ اور چرس بھی پلاتا ہے۔ کہنے لگے کنواروں کی شادیاں بھی کروا دیتا ہے۔ میں نے بادشاہ کے حضور میں سر جھکایا اور آنکھ کھل گئی۔ ہت تیرے خواب کی ایسی تیسی چرس کا دم بھی نہ لگانے دیا...... اور کیا خیر کہ ایک عدد عورت پہلو گرم کرنے کو بھی مل جاتی ......"

اس نے ساری عمر شادی نہیں کی تھی۔ اور پری کے بیان کے مطابق وہ لونڈوں سے عشق معاشقے کرتا تھا۔ اور کسی مہلک جنسی مرض میں مبتلا تھا۔

فدن رکشا بان کے ہاں چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اس خوشی میں کٹڑی میں قوالی کروا دی۔ ساری کٹڑی میں اس نے کوٹھڑیوں کے آمنے سامنے جھنڈیاں لگوائیں۔ آنگن صاف کرواکر اس نے وہاں نائی بلواکر میٹھے چاولوں کی پوری دیگ دم کروانے رکھ دی۔ اس روز صبح ہی سے کٹڑی میں بڑی چہل پہل تھی۔ جب شام ہوئی تو میٹھے چاولوں کی دیگ پک کر تیار ہو گئی۔ سب کوٹھڑی والوں میں چاول تقسیم کئے گئے۔ کبڑا مولوی چاولوں کی پوری پرات بھر کر اپنی کوٹھڑی میں لے گیا وہ دو روز تک میٹھے چاول کھاتا رہا اور ادھر اُدھر چلتا پھرتا ڈکاریں مارتا رہا۔

رات ہوئی تو قوالوں کی آمد کا انتظار شروع ہو گیا۔ فدن نے قوالوں کو بلانے کے لیے پینتیس بارہ کے ڈرائیور اور ایک ایسیم مستری کو خاص طور پر بھیجا ہوا تھا۔ کٹڑی میں بجلی نہیں لگی تھی۔ فدن نے سینما والوں سے رات کی رات بجلی مانگ کر ایک تار اپنی طرف کھینچ لی اور کٹڑی کے وسط میں ایک بڑا سا بلب روشن کر دیا گیا۔ پہلی بار اپنی کوٹھڑیوں کے سامنے اتنی تیز روشنی دیکھ کر عورتوں کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور وہ ماتھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر ایک دوسری سے باتیں کرنے لگیں فدن کی کوٹھڑی کے باہر ایک تخت پوش لا کر بچھا دیا گیا۔ اس تخت پوش پر سینما اپریٹر بالا کے گھر سے چھپی ہوئی پھولدار جازم لا کر ڈال دی گئی۔ فدن نے کرائے پر دریاں منگوا کر اِدھر اُدھر زمین پر بچھوا دیں۔ خوش بہار کا موسم تھا۔ جاڑا رخصت ہو گیا تھا۔ اور گرمیوں کی آمد آمد تھی اِدھر اُدھر سے لوگ آ کر دریوں پر براجمان ہو گئے۔ فدن نے چاولوں کی دیگ خالی کروانے کے بعد اسی میں میٹھی چائے چولہے پر رکھوا دی۔ لال خان سامان چائے پکوانے کا انچارج تھا۔ وہ پیالی میں چائے ڈال کر اسے چکھتا اور رسہ سیکڑ کر کہتا:۔

"پتی تیز نہیں۔ میٹھا بھی زیادہ ہے۔ فدن چائے کا ڈبہ تو لانا۔"

گلو گیٹ کیپر نے آ کر سارے ماحول کا جائزہ لیا اور بڑھک مار کر بولا۔

"یا علیؓ حیدر — مبارک ہو بھئی فدن۔ شو ٹوٹنے تک قوال مصرع نہ اٹھانے پائیں۔"

فدن نے تخت پوش پر ایک میلا سا گاؤ تکیہ ٹکا کر کہا:۔

"فکر نہ کرو لالہ! تم آؤ گے تو قوالی شروع ہو گی۔"

میں اور پرسی نے بلے شاہ کے تندور پر جا کر فدن کے دیئے ہوئے میٹھے چاول گرم کروائے دہی کے ساتھ خوب مزے لے کر کھانے کے بعد کٹڑی میں تخت پوش کے پاس آ کر قوالی سننے کے لئے بیٹھ گئے۔ فدن بڑا مصروف تھا۔ اس کے ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینہ آیا ہوا تھا۔ اور وہ کبھی کوٹھڑی میں جاتا اور کبھی باہر آ کر خالی پیالیوں کی قطار کو گننا شروع کر دیتا۔

"لال ذرا پیالیوں سے خبردار رہنا۔"
لال خانساماں چائے کی دیگ میں بانس کی مدد سے چینی ہلاتے ہوئے بولا:۔
"بے فکر رہو فدن ۔ بڑی بڑی پالٹیوں میں لوگوں کو چائے پلائی ہے۔
کیا مجال جو ایک پیالی بھی اِدھر اُدھر ہو جائے۔"
پورے دس بجے رات ڈرائیور اور ابراہیم ورکشاپی کٹڑی میں وارد ہوئے ڈرائیور نے گرجدار آواز میں اعلان کیا۔
"ارے فدن کیا یاد کرو گے قوالوں کے ساتھ ساتھ رہس دھاریوں کا بندوبست کر آئے ہیں۔ ایک ٹکٹ میں دو کھیل ہوں گے۔ گھبراؤ نہیں رہس دھاری تم سے کچھ نہیں لیں گے۔ ان کے پیسے میں نے ادا کر دیئے ہیں۔"
ابراہیم ورکشاپی نے اپنی مڑی ہوئی ناک پر انگلی پھیر کر کہا:۔
"قوال تو بس آرہے ہوں گے۔ ہم انہیں تانگے میں بٹھلا کر آئے ہیں۔"
لال خانساماں نے کہا:۔
"اور تم ہوائی جہاز پر آئے ہو کیا؟"
ڈرائیور ہنس کر بولا:۔
"چچا چھبیس اٹھتی خالی آرہی تھی۔ میرا یار اسے گیراج میں لے جا رہا تھا۔ ہم تو اپنی کمپنی کی بس میں بیٹھ کر آئے ہیں۔"
رہس دھاریوں کا قصہ یہ تھا وہ کسی قریبی دیہات سے آکر قوالوں کے ہاں مقیم ہوئے تھے۔ اور اگلے روز دوپہر کو واپس جا رہے تھے۔ اتفاق سے ان رہس دھاریوں کا گاؤں ڈرائیور کی روٹ میں پڑتا تھا۔ ڈرائیور نے انہیں پیش کش کر دی کہ وہ اگر اس کے یار فدن کے ہاں آج رات ہیر رانجھے کا ناٹک دکھا دیں تو وہ کل انھیں اپنی بس میں مفت بٹھلا کر ان کے گاؤں پہنچا دے گا۔ رہس دھاری مان گئے اور انہوں نے ناٹک دکھلانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب ان لوگوں کی ٹولی کٹڑی میں داخل ہوئی تو ہر شخص کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ کٹڑی کے بچے ان کے آگے آگے شور مچاتے بھاگتے دوڑتے

اور ایک دوسرے کے ٹانگ اڑا کر زمین پر گرانے لگے عورتوں نے اپنی کوٹھڑیوں کے دروازوں کے عقب میں کھڑے ہو کر بوریئے اٹھا کر قوالوں اور رہس دھاریوں کو دیکھا۔ طے یہ ہوا کر پہلے رہس دکھاری اپنا کھیل دکھائیں گے اور قوالی بعد میں ہوگی۔

ان رہس دھاریوں میں ایک پتلا دبلا نوعمر سا دیہاتی لڑکا تھا۔ جس کی آنکھیں نشیلی تھیں۔ اور چمکیلے لمبے بال، شانوں پر پڑے تھے۔ یہ لڑکا ہیر کا بھیس بدل کر سامنے آگیا اور نرت کرنے لگا۔ ڈھولک بجانے والا گھٹنوں میں ڈھولک دبائے اس پر آدھا جھکا ہوا تھا۔ ایک تالی پیٹ رہا تھا۔ دوسرا دونوں ہاتھ پھیلائے گا رہا تھا۔ اور بیچ بیچ میں ہیر کو بڑھاوا بھی دیئے جاتا۔

" ذرا جم کے میرے بیٹے "

ہیر نے چہرے پر بے تحاشا سرخی پوڈر تھوپ رکھا تھا۔ اور دیہاتی عورتوں کی نقل میں سبز رنگ کا تہمد اور سرخ کناری والا لمبا کرتہ پہنے ہوئے تھی۔ ڈرائیور تو اس کا حسن دیکھ کر بھونچکا ہو گیا۔ ابراہیم کو کہنی مار کر بولا :۔

" اس نے تو نتھی میراثن کو مات کر دیا یار "

" بڑا اسٹی فین لونڈا ہے "

اور وہ لونڈا آنکھیں نچاتا، ابرو گھماتا ہیر کے بھیس میں یہ لوک گیت گا رہا تھا۔

بابے جی کی گڑدی دا شربت در گا پانی
میر لیوڑوں دو کڑیاں آئیاں اک پتلی اک بھاری
پتلی توں سے گئے جٹ بار دے بھاری رہ گئی کنواری
نے آپے تینوں نے جان گئے جنہاں نوں لگیں گی پیاری
تے بابے جی دی گڑدی دا ....

لوگ جوش میں آکر بار بار تالیاں پیٹتے۔ رانیں بجاتے۔ ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے۔

ایر پیٹر بالا سبز چادر اوڑھے فدن کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اور مزے میں جھوم جھوم کر اس لونڈے کی کھیر بنانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ابراہیم درکشائی نے فتوے دے دیا تھا کہ اگر اس لونڈے کی شہر میں تربیت ہو تو یہ مس گکو کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

"اس نے توڈانس کے بھمبھا کے نکال دیئے ہیں لالہ!"

ڈرائیور نے شراب پی رکھی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کہ وہ اس خوشی کے موقع پر شراب نہ پیتا۔ وہ اپنے ایک ڈرائیور یار کی بغل میں بیٹھا نشے میں بار بار مسکرا رہا تھا۔ پان چبا چبا کر ناک سے سانس لیتے وقت سیٹی کی سی آواز پیدا کرتے ہوئے بے چین نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں ننھی میراثن اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ دیوار پر اپنے بازو اور ٹھوڑی رکھے کھڑی تھی۔ بجلی کی تیز روشنی میں اس کی ناک کا لونگ کسی وقت چمکارا مارتا تو ڈرائیور سینے پر ہاتھ مار کر کہتا:۔

"خدا! کبھی عاشقوں کے سینے میں بھی ٹھنڈ پڑے گی کہ نہیں؟"

کبڑا مولوی درمیان دری پر بیٹھا داڑھی میں بار بار ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اور مکار نگاہوں کی گردش سے چاروں طرف کی خبر گیری کر رہا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ کون کس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور کون کس کو اشارے کر رہا ہے۔ ناچنے والے لونڈے نے ایک چکر لگا کر ڈھولک کی تال پر گھنگھرو والا پاؤں زمین پر مارا تو ڈرائیور نے خوشی سے چیخ کر کہا:

"خوش رہ میرے دل پر چھریاں چلانے والے۔"

پھر جیب سے ایک روپیہ نکال کر اپنے یار کے سر پر رکھ کر بولا:۔

"اپنی مستانی آنکھوں کے صدقے۔ کر جا ہمارا مال بکری۔"

لونڈے نے شرما کر روپیہ اٹھا لیا۔ اور چکر لگا کر ڈرائیور کے نام کا اعلان کر دیا۔

کبڑے مولوی نے لال خانساماں کی طرف گھور کر کہا:۔

"یہ شریعت کے خلاف ہے۔"

اور پھر اس لونڈے کو گھورنے لگا۔ جو عورت کے لباس میں بڑا من موہن لگ رہا تھا۔

ڈرائیور کی بیوہ ساس بدنصیب بڑھیا اپنی کوٹھڑی کے آنگن میں کھاٹ پر پڑی تھی اس کی بہو اور دوسری عورتیں دیوار کے ساتھ لگی رہس دیکھ رہی تھیں۔ بدنصیب بڑھیا آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے انہیں دیکھنے کی کوشش کرتی اور پوچھتی:۔

"ادھر کیا ہو رہا ہے؟ یہ گلو نے بجانے کی آواز آرہی ہے؟ کیا میرا یٰسین آگیا؟ کل اس کا خط آئے گا۔ میری لاٹھی کہاں چلی گئی؟"

پھر وہ ادھر ادھر ہاتھ مارتی لاٹھی ڈھونڈنے لگ جاتی۔

عبداللہ نامی خبط الحواس بھیک منگا بہرا بھی ایک طرف دیوار کے ساتھ ٹک کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور عینک کے پیچھے سے ناٹک دیکھ کر خوش ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی سی تھیں اور نچلا ہونٹ یوں لٹک گیا تھا کہ تمیز کرنا مشکل تھا۔ وہ ہنس رہا ہے۔ یا رونے والا ہے۔ اس کی گنجی چندیا روشنی میں چمک رہی تھی۔ گلو گیٹ کیپر نے روپیہ نکال کر عبداللہ کے سر پر دھپ جما کر بولا:۔

"اے کھوسٹ آج تیرے بھی دن پھر گئے۔"

عبداللہ نے خود فراموشی کے عالم میں ہاتھ پھیلا دیا۔ جیسے بھیک لے رہا ہو۔ گلو نے قہقہہ لگا کر کہا:۔

"بڈھا سٹھیا گیا ہے۔"

پھر دوسری دھپ جما کر بولا:۔

"بچ مو ٹر توں"

عبداللہ بڈھے کی عینک کھسک گئی۔ اس کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ وہ عاجزی سے مسکرا کر لوگوں کے منہ تکنے لگا۔ لال خانساماں نے گلو کو منع کیا کہ وہ عبداللہ کو تنگ نہ کرے ابراہیم ورکشاپی نے وہیں سے آواز لگائی۔

"چچا آج کے دن سب معاف ہے۔ آج ہر شے کا جز نکال دیا جائے۔"

گیٹ کیپر گلو نے اپنے سر پہ ہلکا سا مکا مار کر پرسی سے کہا:۔

"طبیعت بھاری ہو رہی ہے۔ ابھی آیا۔"

وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ باہر جا کر وہ نالی پر بیٹھ گیا۔ ناک پہ زور سے انگلی ماری اور وہاں سے خون جاری ہو گیا۔ جب کافی خون بہہ گیا۔ اور گلو کی طبیعت ہلکی ہو گئی۔ تو اس نے رومال گیلا کر کے نتھنوں میں ٹھونسا اور پھر منڈلی میں آن شامل ہوا۔

ناٹک میں جب یہ دکھایا جا رہا تھا کہ رانجھا سادھو بنا بیٹھا ہے۔ اور ہیر اس سے دل کا حال پوچھنے اپنی نند سہتی کے ساتھ آئی ہے۔ تو اچانک کٹہری میں جٹا دھاری پاگل نمودار ہوا۔ اس نے وہیں سے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر دوسرا ہاتھ پھیلایا اور گانے لگا :-

ہیر آکھدی جوگیا جھوٹ بولیں کون رٹھڑے یار مناؤندا ای
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈھ تھکی جیہڑا دچھڑے یار ملاؤندا ای

پھر فوراً دوسرا ہاتھ بھی کان پر رکھ دیا اور دوسرا گیت شروع کر دیا۔

ے سولی چڑھ منصور پکارے ملدے عشق ہلارے نی

لوگوں نے گردنیں پھیر کر اسے دیکھا اور ہنسنے لگے۔ ڈرائیور نے نشے کی ترنگ میں پوچھا

" ہمارے بادشاہ سلامت کیا حال ہے ؟"

پاگل ایک دم زانوؤں پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ اور موٹی موٹی گول آنکھیں ادھر ادھر گھما کر بولا :-

" میری ملکہ کھو گئی ہے۔ بادشاہ سلامت اداس ہے۔ وہ میرا روٹی کا ڈبہ بھی ساتھ لے گئی ہے۔"

پھر کیٹرے مولوی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا :-

" مولبی ہاتم میرے وزیر اعظم ہو۔ رعایا سے کہو کہ وہ خوب قوالیاں کروائے عیش کرے۔ اب میرا راج ہے۔ رات کو کتا بالکل نہ بھونکے۔ عف عف ...."

اس کے بعد وہ کتے کی طرح بھونکتا مجمع سے باہر نکل گیا :-

ہیر رانجھے کا ناٹک ختم ہوا۔ تو قوالوں نے پرپرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ ان کی ٹولی سامنے تخت پوش پر آکر بیٹھ گئی۔ طیلچی نے فدن سے کہوا کر اندر سے گیلا آٹا منگوایا۔ اور اسے طبلے پر تھوپنے لگا۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ کچھ پیشاب وغیرہ کرنے ادھر ادھر ہو گئے۔ سگریٹ سلگا لئے گئے۔ چائے کا دور شروع ہو گیا۔ رہس دھاریوں کے نمائندے، نے ڈرائیور کے پاس آکر اسے تاکید کی، کہ وہ صبح بس کے اڈے پر موجود رہے۔ ڈرائیور نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا :-

"مرد قول کے پکے ہوتے ہیں۔ تم نے مرد سے بات کی تھی۔ صبح اڈے پر آجانا بادشاہو۔ تم کہو تو میں اپنی پینتیس بارہ میں بٹھلا کر تم لوگوں کو غیر علاقے میں چھوڑ آؤں۔"

پھر وہ اس زور سے قہقہہ مار کر ہنسا کر رہس دھاری بے چارہ بھونچکا سا ہو کر پرے ہٹ گیا۔ ان لوگوں نے چائے کی پیالیاں ہاتھوں میں تھام رکھی تھیں۔ اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ قوالوں کی ٹولی بھی تخت پوش پر چائے پینے میں مشغول تھی۔ رہس دھاریوں کے دلکش لونڈے سے بات چلی اور بیت بازی پر آگئی۔ ابراہیم ورکستاپی نے کہا:

"اگر پنجابی شعروں میں سے دودھ اور دہی کا جز نکال دیا جائے۔ تو وہ اردو کے شعر بن جائیں گے۔ مثلاً ایک اردو کے شاعر نے کہا ہے۔

ہم ہوئے کہ تم ہوئے کہ غریب و امیر ہوئے
سارے کے سارے اس کی زلف کے اسیر ہوئے

کیوں؟ کیسا اٹھ دھانگ شعر ہے گلو!"

گلو نے چائے کا کپ غٹا غٹ چڑھا کر گیلے رومال سے ناک پونچھ کر کہا:۔

"بیٹا ایک شعر مجھ سے بھی سنو! کہتا ہے۔

درد دل سے ہوں میں تڑپتا میرا کس کو درد ہے۔
میں تو ہوں لفظ درد جس پہلو سے الٹو درد ہے۔"

اس شعر پر واہ واہ کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔ ڈرائیور نے سینہ پیٹ لیا اور ہائے وائے کرتا اپنی کوٹھڑی میں گیا۔ کونے میں آٹے کے کنستر کے پیچھے رکھی ہوئی شراب کی بوتل میں سے دو تین چسکیاں لگائیں اور پھر اپنی منڈلی میں آن بیٹھا۔ منہ پونچھ کر بولا:۔

"ہندوستان میں ایک میلہ لگا کرتا ہے۔ جسے کمبھ کا میلہ کہتے ہیں۔ ایک لڑکی اس میلے میں گئی۔ بڑی بیوٹی فل تھی۔ دریا کنارے چلی جارہی تھی۔ کہ پاؤں پھسل گیا اور پانی میں گر پڑی۔ اس کی سہیلیوں نے اسے باہر نکالا تو ساڑھی بھیگ رہی

تھی۔ لڑکی نے بھیگی ساڑھی کو نچوڑا تو شاعر وہاں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آہ بھر کر بولا :۔

ے اُف کس نے نچوڑی بھیگی ہوئی ساڑھی دریا پر
کہ دل کو میرے ظالم نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا

پھر ننھی کے مکان کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری اور فدن کو آواز دی

"فدن یار! وہ تمہارے پان کدھر چلے گئے"

فدن نے قوالوں کے سامنے سے پانوں کی طشتری اٹھا کر ادھر بھجوا دی۔

"بھجوا رہا ہوں بیٹا"

بہ ظاہر تو وہاں شعر و شاعری ہو رہی تھی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہر ایک کی آنکھ ننھی میراثن کی طرف لگی ہوئی تھی۔ جو بن سنور کر اب پھر اپنی کوٹھڑی کی دیوار کے اوپر نمودار ہو گئی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اندر کی طرف کے ساتھ لگی ہوئی بانس کی سیڑھی پر کھڑی ہے۔ اس نے دونوں کہنیاں منڈیر پر رکھی تھیں اور کنکھیوں سے اپنے عاشقوں کے دلوں پر محبت کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ لم تڑنگ بلا ایریٹر دیوار کے قریب سے گزرا تو ننھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ ڈرائیور نے جل بھن کر وہیں سے یہ شعر الاپا۔

ے ملنا جلنا رقیباں نال بند کر دے
تیرا حسن دا نشتہ بگاڑ دے ساں
چاقو چمکدا دیکھ لے ہتھ میرے
تیرا مخملی پیٹ میں پھاڑ دے ساں

ننھی میراثن بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ اس نے اپنی سہیلی کی طرف دیکھ کر منہ چڑایا اور نفرت کے انداز میں ایک طرف تھوک دیا۔ گلو گیٹ کیپر نے بناوٹی چھینک مار کر کہا،

ے "دل لین والیا تیرا اگکھ نہ رہے"

عین اس وقت قوال نے ہارمونیم کا سُر چھیڑ دیا اور آنکھیں بند کر کے حمد باری شروع کر دی۔

قاف کراں بیان میں صفت اوہدی
جسدے واسطے ایہہ کل گل زار کھڑیا

سب کے چہرے لٹک گئے اور آنکھوں میں دکھاوے کا احترام جھلکنے لگا۔ حمد باری ختم ہوئی تو قوالوں نے ایک عاشقانہ چیز شروع کر دی۔ ہر آدمی کے کان کھڑے ہو گئے اور آنکھیں چوکنی ہو کر دور و نزدیک کی خبر لانے لگیں۔ قوال کی ترکی ٹوپی کا میلا کچیلا پھندنا دائیں بائیں گردش کر رہا تھا۔ طبلہ بجانے والا دہرا ہو رہا تھا۔ دور سے یوں لگتا جیسے وہ طبلے کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تالی بجانے والا بڑے مزے اور لہک کے ساتھ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا اور گردن گھما کر آنکھیں جھپکا کر ہاتھ اوپر اٹھا لیتا۔ یوں محسوس ہوتا گویا وہ بڑی ہی چٹ پٹی چیز کھا رہا ہے۔ اور کسی کو بتانا نہیں چاہتا کہ وہ کیا کھا رہا ہے۔ وہ بڑے مگن ہو کر قوالی کر رہے تھے اور لوگ ان سے بھی زیادہ مگن ہو کر قوالی سن رہے تھے۔ قوال بیچ بیچ میں جب دوہے گا کر واپس سم پر آ کر ہاتھ مارتا تو سب لوگوں کے سر ہل جاتے اور واہ واہ کا نعرہ بلند ہوتا کبڑا مولوی اب قوالوں کے بالکل سامنے اپنے دوسرے درویش نما مولویوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کندھے پر بسنتی رومال پھیلا رکھا تھا اور ڈالڈا لگی سیاہ داڑھی بجلی کی روشنی میں جھل جھل کر رہی تھی۔ وہ بڑے کرخت انداز میں قوالوں کو گاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چوری چوری ننھی میراثن کی کوٹھڑی کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ پھر وہ اللہ اکبر کہتا اور داڑھی میں ہاتھ پھیر کر دوبارہ اپنی قہر آلود نگاہیں قوالوں پر گاڑھ دیتا۔ اس کے تکنے کے انداز سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اگر اس کا بس چلے تو وہ ہارمونیم کے دو ٹکڑے کر دے۔ طبلے پھاڑ دے اور قوالوں کی گردنیں قلم کر کے ان کی ہتھیلیوں پر رکھ دے۔ عبداللہ نامی بڈھا برآمدے میں بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ اس نے اپنا پریشانیوں سے بھرا ہوا سر وہیں دیوار کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اس کے میلے ہونٹ ذرا سے کھلے تھے۔ جیسے کسی سے بھیک مانگتے مانگتے وہیں چپ ہو گیا ہو۔ گلو گیٹ کیپر کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر سرخ ہو رہی تھیں اور وہ ساتواں چائے کا کپ پی رہا تھا۔ پرسی اپنی چادر میں لپٹا میرے ساتھ ٹیک لگائے اونگھنے لگا تھا۔ نیند مجھ پر طاری ہو رہی تھی لیکن وہاں سے اٹھنا محال تھا۔ کیونکہ ہمارے ارد گرد لوگوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ڈرائیور حبیب چوتھی بار کوٹھڑی میں شراب کی چسکی لگا کر آیا تو اس نے ابراہیم درکشائی کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا:۔

"کیا بتر بتر تک رہے ہو۔ تمہیں نیند نہیں آرہی۔ صبح ڈیوٹی نہیں "

ابراہیم نے ہتھیلیوں سے چہار گڑکر کہا:۔

"پہلوان سویرے چھٹی ہے اور پھر وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ

ے ہمیں تو آج کی شب تین بجے تک جاگنا ہوگا"

اچانک مجمع میں بیٹھے بیٹھے ایک شخص پر حال طاری ہوگیا۔ اب لوگوں کو شور مچانے اور ایک دوسرے پر آوازے کسنے کا موقع مل گیا۔ جذبات کے جس سیلاب کو ادب واحترام کے پشتوں نے روک رکھا تھا وہ اپنی حدیں توڑ کر بہہ نکلا۔ کوئی حال کھیلنے والے کی کمر سے لپٹ گیا۔ کسی نے اس کی کمر سے لپٹنے والے کی کمر کو ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ کوئی اُٹھ کر ادھر ہٹ گیا۔ کوئی اُدھر سے اُٹھ کر ادھر دوڑ آیا۔ بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ قوال نے ایک مصرعے پر سم پر زور سے ہاتھ مار دیا تھا۔ مصرع یہ تھا۔

چپ کر دھڑ وٹ جا نہ کھول توعشق خلاصہ
چمڑی لتھ جاؤ گی تے جگ دا بن جاؤ ہاسہ

دوہا:۔ کسے نے جاکے پچھیا قبر تے
اے مجنوں تینوں ہویا کی
سُک سُک ہوگیوں کانٹا توں
توں پایا کی تے کھویا کی
اگوں مار کے چیک او بولیا عاشق
پاڑ کے کفن دا برقعہ
تے چپ کر دھڑ وٹ جانہ کھول توں عشق خلاصہ
چمڑی لتھ ......

مجنوں کا اتنا کہنا تھا کہ اس آدمی نے چیخ ماری۔ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے۔ آنکھیں بند کر کے گردن ایک طرف ڈھلکائی اور تھوڑی دیر اسی طرح جھومنے کے بعد یا علی کے نعرہ مستانہ کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کے سر پر دھم سے دو ہتڑ مار دیا۔ وہ غریب

بلبلا اٹھا اور ایک طرف بھاگ گیا۔ لوگوں نے حال کھیلنے والے کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ ادھر قوالوں نے بھی گت تیز کر دی تھی اور اسی ایک مصرعے کو بار بار دھرا رہے تھے۔ ڈرائیور نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا:۔

"مصرعہ لڑ گیا ہے گلو۔ مصرعہ لڑ گیا ہے۔ عشق تو فقیر بنا دیتا ہے۔ ہم سے پوچھو ان عاشقوں کے حال احوال۔"

اس دھما چوکڑی میں پرسی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا "کیا ہو گیا؟" حال کھیلنے والا دھڑا دھڑ زمین پر دوہتڑ چلا رہا تھا۔ وہ دو زانوں ہو کر بیٹھا تھا اور بڑے جوش میں اندھا دھند آگے پیچھے ہل رہا تھا۔ کسی نے کہا:۔

"قوالی بند کرا دی جائے۔"

ابراہیم ورکشاپی نے آواز لگائی

"یہ ظلم نہ کرنا۔ اس کا حال بند ہو جائے گا۔ وہ قلنچی ہو جائے گا قوالو کھل کے گاؤ۔ اس کا حال کھل جانے دو۔ اب قوالی ہی اس کا جز ہے۔"

قوالوں نے گیت بول اور طبلے کی گت تیز کر دی۔ اب حال کھیلنے والے پر ایک وحشت سی طاری ہو گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور زمین پر لوٹن کبوتر کی مانند تڑپنے لگا۔ وہ لوگوں کے شکنجے سے مچھلی کی طرح نکل نکل جاتا۔ وہ کبھی زمین پر سر مارتا۔ کبھی دونوں ہاتھوں سے اپنا سینا پیٹتا اور کبھی دونوں بازو ہوا میں پھیلا کر ایک ٹانگ اٹھا کر طبلے کی تال پر رقص کرنا شروع کر دیتا۔ قوالوں کے گلے ایک ہی مصرعہ بار بار گانے سے خشک ہو گئے تھے۔ طبلچی کا ہاتھ سوج گیا تھا۔ تالی بجانے والے کی گردن دکھنے لگی تھی۔ لیکن اس بندۂ خدا کا حال کسی طرح کم نہ ہو رہا تھا۔ کسی نے مشورہ دیا۔

"اسے دیوار کے ساتھ الٹا لٹکا دو۔"

شرابی ڈرائیور نے رانیں کھجلا کر کہا:۔

"اس کے ساتھ مجھے بھی لٹکا دو۔ میں بھی کسی کا عاشق ہوں۔"

فدا پریشان ہو کر قوالوں کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ کبھی کوٹھڑی کے اندر جاتا اور کبھی

جھٹ سے باہر نکل آتا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ساری شرارت اسی کی ہو۔ کبڑا مولوی خدا جانے کس طرح اب سب سے پچھلی صف میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

"یہ سب خلاف شرع ہے۔ خدا نے صاف صاف کہہ رکھا ہے کہ میں حال کھیلنے والوں کو کافر سمجھتا ہوں۔"

لال خانساماں اپنے دونوں بچوں کو گود میں سلائے چارپائی کے کنارے بیٹھا تھا اور بڑی حیرت اور دلچسپی کے ساتھ یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بڈھے عبداللہ بیرے کی چندیا لوگوں کے ہجوم میں ایک طرف چمک رہی تھی۔ افراتفری کے ریلے نے اسے سب سے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا سر جھکائے قوالی سن رہا تھا اور اس کے ہاتھ اپنے ہی آپ طبلے کی تال پر حرکت کر رہے تھے۔ پورا آدھ گھنٹہ جی بھر کر حال کھیلنے کے بعد وہ عاشقِ صادق بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا سارا بدن ڈھیلا پڑ گیا اور منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ لوگ اُسے دبانے لگے۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا۔ اس نے کلمہ پڑھ کر چہرے پر ہاتھ پھیرا اور لال لال آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ کر بولا:

"تم لوگوں نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟"

اور بڑے اطمینان سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

قوالی کی محفل رات گئے تک جاری رہی اس دوران میں ڈرائیور نے کوٹھڑی کے پھیرے لگا لگا کر شراب کی پوری بوتل خالی کر دی تھی اور اب اسے کافی نشہ چڑھ گیا تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ نظر کسی ایک جگہ نہ ٹکتی تھی۔ اناپ شناپ باتیں کر رہا تھا۔ گلو کو گلا اور ابراہیم کو بے رحم جی کہہ کر بلا رہا تھا۔ قوالی ختم ہو گئی۔ لوگ رخصت ہو گئے۔ قوالوں نے اپنے گھر کی راہ لی۔ کبڑا مولوی اپنی کوٹھڑی میں جا کر سو رہا۔ بدنصیب عبداللہ بھی سو گیا۔ لال خانساماں بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ گلو اور بلا اپرہیٹر بھی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ پری کب کا کوٹھڑی میں جا کر خراٹے لے رہا تھا۔ عورتیں بھی دیواروں سے ہٹ گئی تھیں۔ درمیان میں لٹکا ہوا بجلی کا انڈا بھی گل ہو گیا تھا۔ کوٹھڑی کی کچی دیواروں اور بیچ والی نالی پر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ ڈرائیور شراب کے نشہ

میں ڈدبا زمین پر بیٹھا چارپائی پر سر رکھے اپنا سر پیٹ رہا تھا اور فدّن اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دُلا بھائی کیا کر رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔"

ڈرائیور نے اپنا گریبان پھاڑ لیا تھا۔ وہ جھوم رہا تھا اور ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا رکھا تھا۔

"فدّن — جدّن — تو چلا جا — بس — تو فدّن — جدّن خدا مجھے مار دے۔ میں غنا غار بندہ — پنتی بارہ کا ڈرائیور لائسنس نمبر ایک پنچ ...... ہک ......"

ڈرائیور کی بیوی بوریا اٹھا کر اپنے خاوند کو بلانے لگی۔

"خدا کے لئے گھر آجاؤ۔ کیوں تماشہ دکھا رہے ہو لوگوں کو۔"

ڈرائیور نے آنکھیں سکیڑیں اور مکا تان کر بولا:۔

"تو کُتی عورت .... تو چلی جا ...... بس .... میں غنا غار بندہ..... پنتی بارہ کا ڈرائیور ...... نمبر ایک دو چار ..... ہک ۔"

پھر وہ اچانک ننھی میراثن کی کوٹھڑی کی طرف منہ کر کے زمین پر سجدہ ریز ہو گیا۔ فدّن نے جلدی سے اس کا سر پکڑ لیا۔

"دلّا بھائی۔ کیوں کافر بن رہے ہو؟ خدا کا خوف کرو۔"

ڈرائیور نے ہاتھ جھٹک کر گرجتے ہوئے کہا:۔

"فدن! — نہ کھول تو عشق دا خلاصہ .... ننھی! میری جان! تیری خیر ہووے .... تو میرا .... مشعوق .... ہک ......"

پھر اُٹھ کر فدن کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور بڑی لجاحت سے بولا۔

"فدّن! اگر میں مر گیا .... تو میری .... ہک .... میری قبر پہ ضرور آنا .... میں فدّن! تجھے وڈیکوں گا .... فدن! نہ کھول عشق دا خلاصہ .... ہائے .... نہ کھول ...."

بڑی مشکل سے میں اور فدّن متوالے ڈرائیور کو ڈولی ڈنڈا کر کے اس کی کوٹھڑی میں

ڈال آئے۔ اور یوں اس رات قوالی کی محفل ختم ہوگئی۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ اس کٹڑی میں صرف مولوی کبڑا ہی نہیں۔ ہر آدمی ننھی میراثن پر آنکھ لگائے بیٹھا ہے۔ اب میں کس کس سے رقابت رکھتا۔ ادھر وہ نٹ کھٹ لونڈیا تھی کہ ہر ایک کا جی رجھاتی۔ ہر ایک سے مسکرا کر بات کرتی اور ہر ایک کو یقین دلاتی کہ وہ صرف اسی پر جان دیتی ہے۔ دلّا ڈرائیور اس کی ماں کو چوری چھپے پیسے بھجوایا کرتا۔ لال خانساماں کٹڑی والوں کی آنکھ بچا کر اپنے بچے کے ہاتھ ننھی کے گھر اپنے صاحب کے باورچی خانے سے چرائی ہوئی چائے کے پیکٹ پہنچایا کرتا۔ ننھی کی ماں بھی بڑی زمانہ ساز اور کائیاں عورت تھی وہ سب کا مال ہضم کر رہی تھی لیکن کوٹھڑی کی دہلیز کے اندر کسی کو قدم نہ رکھنے دیتی تھی ویسے بھی کٹڑی والے اس سے دبتے تھے۔ وہ بڑی دبنگ عورت تھی اور پل کی پل میں خم ٹھونک کر مردوں کے مقابلے پر اُتر آتی۔ ایسی ایسی گالیاں بکتی کہ مرد بھی کانوں پہ انگلیاں رکھ لیتے۔

قوالی کے دوسرے دن کبڑا مولوی دوپہر کو اپنے کم سن شاگردوں کو یوں سبق دے رہا تھا۔

"بچو قوالی شرع میں حرام ہے۔ جو لوگ قوالی سنتے ہیں وہ مسلمان نہیں ہوتے جو لوگ حال کھیلتے ہیں وہ کافر ہیں۔ کافر کے نیچے نشان لگادو۔"

گرمیوں کا موسم شروع ہوا تو کٹڑی میں رات کو چارپائیوں کا فرش بچھ جاتا۔ مسجد میں عشاء کی نماز پڑھانے کے بعد کبڑے مولوی کو اپنی آخری کوٹھڑی تک پہنچنے کے لئے کئی ایک چارپائیوں کے اوپر سے ہو کر گزرنا پڑتا۔ وہ سوتے ہوؤں کے چہروں کو غور سے دیکھتا اور سر جھٹک کر لوٹ جاتا۔

"سانڈوں کی طرح سو رہے ہیں۔ نہ نماز کا فکر نہ آخرت کا خوف۔ ان میں سے ایک بھی مسجد میں نہیں جاتا تھا۔"

عورتیں اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے آنگنوں میں سوتیں۔ رات کو گرمی۔ حبس، بدبو اور مچھروں کی بہتات ہوتی۔ ہم نے اب دوسری کھاٹ کا انتظام کر لیا تھا۔ میں اوپر سے شروع

شروع میں صحن میں سویا کرتے۔ لیکن گرمی نے جب بُرا حال کر دیا تو ہم اپنی چارپائیاں اُٹھا کر آنگن سے باہر لے گئے جہاں دوسرے لوگوں نے بستر جما رکھے تھے۔ یہاں بڑی بے پردگی ہوتی۔ ہر آدمی ہر حالت میں سویا ہوا دیکھا جا سکتا تھا۔ آدمی رات کو ان لوگوں کو سوتے میں دیکھے تو معلوم ہو کہ میدان جنگ سے لاشوں کو اُٹھا کر چارپائیوں پر الٹے سیدھے ڈال رکھا ہے۔ اکثر ننگی چارپائیوں پر میلے کچیلے تکیے سروں کے نیچے دبائے اپنے بچوں کو سینے پر چڑھائے بڑی قابلِ رحم حالت میں بے سدھ پڑے ہوتے۔ ان کے نیچے کٹڑی کی گندی نالی بہہ رہی ہوتی جس میں سے اُٹھتی ہوئی بدبو فضا کو مکدّر کر رہی ہوتی۔ مچھر بِھنبھنا رہے ہوتے۔ کھٹمل کاٹ رہے ہوتے۔ لیکن کسی پر کچھ اثر نہ ہو رہا ہوتا۔ وہ گویا باغِ بہشت کے صحن میں سو رہے ہوتے جہاں ٹھنڈی ہوائیں خوشبوئیں اڑا رہی ہوتیں۔ اس وقت اگر کوئی بچہ روتا تو باقی بچے بھی اُٹھ کر رونا شروع کر دیتے۔ مائیں پہلے تو انہیں تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرتیں ناکام ہونے کی صورت میں انہیں پیٹنے اور گالیاں دینے لگتیں۔ بچے بھی اتنے ضدی تھے کہ ان پر نہ تو پیار کا اثر ہوتا اور نہ ہی مار ان کا کچھ بگاڑتی۔ وہ جی بھر کر روتے اور جب نیند انہیں دھپ مار کر گرا دیتی تو سو جاتے۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ ان بچوں کی تیز اور کرخت چیخوں سے درختوں میں سوئے ہوئے پرندے تک کھڑبڑانے لگتے لیکن کٹڑی میں سوئے ہوئے مردوں کی نیند میں ذرا بھی خلل نہ پڑتا۔ وہ تختہ بن کر پڑے رہتے۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی ڈرائیور کی پہلی ساس یعنی بدنصیب بڑھیا کی کمزور آواز ابھرتی اور پھر ڈوب جاتی۔

”یٰسین کا خط نہیں آیا۔ خط نہیں آیا میرے بچڑے کا“

ادھر میں کام میں بڑا نکمّا ثابت ہو رہا تھا۔

دراصل پینٹری میرے بس کا روگ نہ تھی۔ پرسی کی انتہائی کوشش کے باوجود مجھے ابھی تک سیدھی لکیر لگانی نہیں آئی تھی۔ پیمانہ ہاتھ میں پکڑتا تو وہ میری مزدوروں ایسی موٹی اور بھدی انگلیوں میں اِدھر اُدھر کھسک جاتا۔ خانوں میں رنگ ایسے بھرتا جیسے کوئی مزدور دیوار پر سفیدی کا برش چلا رہا ہو۔ میری صورت دیکھ کر اُستاد کا پارہ چڑھ جاتا اور وہ پیمانہ میرے سر پر مار کر چنگھاڑتا۔

"کھوتے دیا پترا - تُو تو سانڈ ہانکنے کے لئے پیدا ہوا ہے - تو ادھر کدھر
نکل آیا ؟"
استاد کے پاس کبھی کبھی ایک ریٹائرڈ حوالدار آیا کرتا تھا - اس کے بڑے بڑے گل مچھے تھے - کلّے پھولے ہوئے تھے - جن کے درمیان شلجم ایسی ناک دھری تھی - وہ ہر بات میں اٹلی کا ذکر ضرور کرتا - جنگ کے دنوں میں وہ بن غازی کے محاذ پر جرمنوں کے خلاف لڑتا گرفتار ہو گیا تھا اور جنگی قیدی کی حیثیت سے اٹلی میں کئی ماہ رہا تھا - ہمارے استاد کو تصویر بناتا دیکھ کر وہ سر کھجا کر فتو لے دیتا :-

"آرٹ تو بس اٹلی میں ہے - جرمن کے لوگ بھی اچھے ہوتے ہیں - مگر استاد جی اٹلی والے لوگ بہت اچھا آرٹ بناتے ہیں - قینچی سے کاغذ کاٹ کر اس کی تصویر بنانے میں تو ان کا جواب نہیں - تم باتیں کر رہے ہو اور وہ قینچی کے دو تین اُلٹے سیدھے ہاتھ چلا کر تمہاری تصویر تمہارے ہاتھ پر رکھ دیں گے "

جب اسے میرے نکمے پنے کا علم ہوا تو وہ گردن طوطے کی طرح گھما کر بولا :-

"اگر یہ لڑکا اٹلی میں ہوتا تو آرٹ سیکھ سکتا تھا - میں دیکھ رہا ہوں اس کی انگلیاں موٹی ہیں - ایسی انگلیاں اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں - اٹلی میں میری ملاقات ایک مکے باز سے ہوئی - وہ اپنے زمانے کا بڑا مصوّر تھا - مصوّر نہیں تو یہ لونڈا مکا باز ضرور بن جاتا "

ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز استاد نے مجھے صاف صاف کہہ دیا :-

"برخوردار ! یہاں اب تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں - تم نے اپنے آپ کو اس کام کے لائق ثابت نہیں کیا - میرے کوئی ہل نہیں چل رہے کہ میں تمہیں اپنی ذمہ داری پر پچاس روپے مہینہ مفت دلواتا رہوں - دوسروں کا احسان بھی لوں اور حاصل بھی کچھ نہ ہو - تم کل سے نہ ہی آؤ تو اچھا ہے "

میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا - کیونکہ میں بھی اس روز روز کی دانتا کل کل سے تنگ آ گیا تھا - قسمت میں روٹی کا چکر تو لکھا ہی تھا - یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر میں آزردہ خاطر

ہو جا کر بیٹھ جاتا۔ دل میں اس بات کا پورا بھروسہ تھا کہ کام کرنے والے ہاتھوں کو اس وسیع دنیا میں کام کی کمی نہیں۔ میں پرسی کی کوٹھڑی میں آکر پڑ رہا۔ من ہی من میں اس دبدبا میں تھا کہ اب کس نگری کو آباد کیا جائے۔ اگرچہ پرسی مجھے کسی قیمت پر الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ برابر مجھے یہی کہتا:۔

"میں دوسرے سینما والوں سے بات کر کے تمہیں وہاں ملازم رکھوا دوں گا تم فکر نہ کرو اور یہاں سے چلے جانے کا بالکل نہ سوچو"

لیکن میں وہاں سے اڑنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ کیونکہ میں اپنے دوست کے لئے بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ اب ایک ایسا اتفاق ہوا کہ میں ایک بار پھر وہیں رہ گیا۔ ہمارے ہی سینما کے مینیجر کو ایک چپڑاسی کی ضرورت ہوئی تو پرسی نے استاد سے کہلوا کر میرا نام دے دیا شام کو پرسی نے خوشخبری سنائی اور کہا:۔

"ایک تو چپڑاسی کا کام بڑا آسان ہے۔ دوسرے تمہیں پیسے بھی زیادہ ملیں گے۔ کچھ دیر یہ نوکری کرو پھر میں بھی تمہارے ساتھ کسی دوسرے ملک میں قسمت آزمائی کو نکل چلوں گا"

میں مطمئن ہو گیا۔ اور کچھ جان میں بھی جان آگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ بے روزگاری غریب کے لئے سب سے بڑا عذاب ہے۔ وہ غم زدہ رہ سکتا ہے مگر بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر وہ کام نہیں کرے گا تو اسے روٹی نہیں ملے گی۔

دوسرے روز میں نوکری پر حاضر ہو گیا۔

مجھے ایک سبز وردی مل گئی۔ سبز قمیض۔ سبز پتلون اور سنہری پیٹی۔ میں بن سنور کر سینما کے مینیجر کے دفتر کے باہر سٹول پر بیٹھ گیا اور ہر گھڑی اس گھنٹی کا منتظر رہنے لگا جو مجھے اندر بلانے کے لئے بجائی جاتی تھی۔ چند ہی دنوں کے بعد یہ گھنٹی میری زندگی کی سب سے بڑی ذمہ داری بن گئی۔ میرے کان ہر وقت اس کی آواز پر لگے رہتے۔ اس کی آواز پر میں جیسے کسی غیبی قوت کے زیر اثر اپنے آپ سٹول پر سے اٹھتا اور دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا۔

سینما کے مینیجر کو پہلی نظر دیکھنے سے کلہاڑے کا خیال آتا تھا۔ بانس کی طرح لمبا کھڑکھڑاتا

جسم اور آگے کو اٹھی ہوئی تیشے ایسی ناک ۔ چلتے ہوئے صرف ٹانگیں حرکت کرتیں۔ اوپر کا دھڑ بالکل ساکن رہتا۔ معلوم ہوتا کوئی مردہ قبر سے اُٹھ کر آگیا ہو۔ رنگ کالا بھجنگ، سپیڑیں ایسی لال لال شنگرفی آنکھیں جو اندھیرے میں انار کے دانوں کی طرح جگر مگر کیا کرتیں۔ مجھے پہلی بار وردی پہنے سٹول پر سے اُٹھ کر سلام کرتے دیکھا تو کرخت لہجے میں پوچھا:۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے نام بتایا تو سر جھکا کر "ہوں" کہا اور دفتر میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بج اُٹھی۔ میں فوراً اندر آگیا۔ وہ کرسی پر پیچھے کو جھکا ٹانگیں میز پر رکھے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

"تم نئے آدمی ہو۔ ایک بات دھیان میں رکھنا۔ کوئی آدمی میری اجازت کے بغیر اندر نہ آنے پائے خواہ وہ لاٹ صاحب کا سالا ہی کیوں نہ ہو اور کوئی عورت دروازے کے پاس آکر اندر داخل ہوئے بغیر باہر نہ جانے پائے سمجھے؟"

"جی صاحب"

"کیا سمجھے؟"

میں نے فوراً کہا:۔

"کوئی عورت ......"

منیجر ہنس پڑا۔ دراز میں سے ایک سگار نکال کر اسے ہونٹوں کے پاس لا کر سونگھا اور لال لال آنکھیں گھما کر بولا:۔

"سگریٹ پیتے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا:۔

"جی صاحب"

اس نے سگار میری طرف لڑھکا دیا۔

"ترچناپلی کا سگار ہے بچو ۔۔ پیو گے تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ چلو اب یہاں سے نکل جاؤ مجھے کام کرنا ہے۔"

میں سلام کر کے جھٹ سے باہر آگیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ میں دل میں

بڑا خوش ہوا کہ پہلے ہی روز مالک نے خوش ہو کر بلایا۔ ہنس مکھ آدمی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ روز اچھے گزر جائیں گے۔ رات کو میں نے پرسی کو سارا واقعہ سنا ڈالا۔ اس نے سگار میرے ہاتھ سے لے کر سلگایا اور ہلکا سا کش لگا کر بولا:۔

"منیجر دل کا بڑا اچھا ہے۔ زبان کا ذرا کڑوا ہے۔ استاد کہا کرتا ہے کہ وہ عورتوں کا دیوانہ ہے اور ہر عورت سے یارانہ گانٹھ لیتا ہے۔ یار یہ سگار تو بڑا کڑوا ہے۔"

میں نے کہا:۔

"مگر دل کا بڑا اچھا ہے۔"

پرسی نے زور سے کش کھینچا اور پھر کھانستے کھانستے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ میں نے سگار اس کے ہاتھ سے لے لیا اور خود ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ سگار کا تمباکو بڑا کڑوا تھا اور معمولی سا کش لینے سے ہی یوں محسوس ہوتا گویا حلق میں کوئی پرندہ اپنی چونچ مار رہا ہو۔ میں نے سگار پرسی کے حوالے کر دیا۔

مجھے سینما میں چپڑاسی کا کام کرتے دو ماہ گزر گئے تھے۔ میں نے کچھ کپڑے بھی بنوا لئے تھے اور اب شام کو پرسی کے ساتھ ملیشئے کی پتلون پہن کر قلندر ہوٹل جایا کرتا۔ میں نے کچھ نئے دوست بھی بنا لئے تھے۔ جنہیں میں سینما کے پاس دیا کرتا تھا۔ منیجر اور میرے درمیان کافی افہام و تفہیم پیدا ہو گئی تھی۔ مثلاً وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کام کرنے میں بڑا کھرا آدمی ہوں اور کبھی آلکسی پن یا کمزوری نہیں دکھاتا۔ میں نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ منیجر ہر اس عورت سے جنسی تعلقات پیدا کرنے کے درپے ہو جاتا ہے جو ایک بار ان کے دفتر میں داخل ہو جاتی ہے۔ کچھ عورتیں مستقل طور پر اس کی دوست تھیں اور روزانہ ہر دوسرے تیسرے اس کے پاس آجایا کرتیں۔ وہ سینما دیکھتیں۔ کھاتی پیتیں۔ منیجر کی آغوش گرم کرتیں اور کھٹ کھٹ کرتی تو دو گیارہ ہو جاتیں۔

منیجر کا سینما کی دوسری منزل میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ چھوٹا سا تھا اور یہاں ایک پلنگ، سنگار میز اور دو تین کرسیاں اور تپائی رکھی تھی۔ منیجر دوپہر کو یہاں اپنی دوست

عورتوں کے ساتھ آرام کیا کرتا۔ اس کمرے کا سارا بھید مجھے معلوم تھا۔ منیجر مجھے آنکھ سے اشارہ کرتا اور میں فوراً پچھلی طرف سے اوپر جا کر کمرہ کھول دیتا اور تپائی پر شراب کی بوتل اور گلاس سجا دیتا۔ پنواڑی سے برف لا کر اسے توڑتا اور تھرمس بوتل میں بھر کر پاس ہی رکھ دیتا۔ چوک سے گرم گرم سموسے اور نمکین پارے لے آتا اور خود نیچے آ کر اپنے سٹول بیٹھ جاتا۔ جس وقت منیجر اپنی کسی دوست عورت کے ساتھ اوپر جاتا تو تھوڑی دیر بعد میں بھی اوپر پہنچ جاتا اور دروازہ بند کر کے اوپر چوکس ہو کر بیٹھ رہتا۔ اسی وقت کسی چڑیا کی بھی مجال نہ ہوتی کہ اندر پر مار سکتی مجھے اندر سے عورت کے ہلکے ہلکے قہقہوں اور بات بات پر ہنہ، نہ کرنے کی آوازیں سنائی دیتیں اور میری کنپٹیاں بج اٹھتیں۔ ٹانگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ دماغ شائیں شائیں کرنے لگتا اور ہاتھ پاؤں اکڑے سے جاتے۔ میں دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑ رگڑ کر اٹھ کر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگتا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیتا اور اپنی محبوبہ نتھی کے خیال میں کھو جاتا نتھی، جو سب کی تھی اور کسی کی بھی نہیں تھی۔ جس نے کبھی مجھ سے پیار کی بات نہ کی تھی۔

میں چونکہ دروازے کے ساتھ لگا سٹول پر بیٹھا ہوتا اس لئے بڑی آسانی سے دروازے کے سوراخ میں سے اندر جھانک سکتا تھا۔ کبھی کبھی جب اندر عورت کے قہقہوں کی آواز بلند ہو جاتی تو میں دھڑکتے ہوئے دل اور خشک ہونٹوں کے ساتھ کنجی والے سوراخ میں سے کمرے کے اندر جھانک لیتا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میرا دل زیادہ تیزی سے دھڑکنے لگتا اور میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے۔ مرد عورت دونوں الف ننگے پلنگ پر ایک دوسرے کی آغوش میں بیٹھے شراب کے جام لنڈھا رہے ہوتے۔ کالے بھجنگ منیجر نے عورت کے گورے گورے بدن کے گرد اپنے سانپ ایسے بازو حمائل کر رکھے ہوتے اور شراب کے نشے میں اس کے ساتھ ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا ہوتا۔ وہ اپنے چپٹے ہونٹ پھیلا کر عورت کے رخسار چومنے لگتا اور پھر اس کی چھاتیوں پر ناک رگڑنی شروع کر دیتا۔ صوفی ہوٹل میں بھی میں نے فحاشی کے مناظر دیکھے تھے لیکن منیجر ان سب پر سبقت لے گیا تھا۔ صوفی ہوٹل کے گندے اور غلیظ ماحول میں جو عیاشی ہوتی تھی ان میں ایک طرح کا مردانہ پن اور بے باکی پائی جاتی تھی۔ لیکن اس صاف ستھرے سجے سجائے چمکیلے کمرے میں مرد عورت کی اور عورت

مرد کی تذلیل کر رہی تھی۔ وہ دونوں ایسی ایسی مکروہ اور شرمناک حرکات کرتے کہ شہوت کی بجائے میرا جی متلانے لگتا اور منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ اس خیال سے کہ کہیں قے نہ ہو جائے دوسری منزل سے نیچے آتے جاتے سینما کی فراخ مرمریں سیڑھیوں میں طم تڑانگ بلا اپریٹر سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ چٹکی سے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر پوچھتا:۔

"سناؤ بھئی مسٹر بھوندو کیا حال ہے؟ اب تو پاؤ بارہ ہے ناں؟ یار کبھی کبھی کوئی عورت ہو تو اوپر ہمارے کیبن میں بھجوا دیا کرو ذرا ہم بھی اس کی کھیر بنا لیا کریں۔"

سلائیڈیں چلانے والا مجھ سے بڑی مروت سے پیش آتا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ میں منیجر کا خاص چپڑاسی ہوں اور اکثر شراب کی دعوت دیا کرتا لیکن ایک تو مجھے شراب کی عادت نہیں تھی۔ دوسرے میں ان لوگوں سے زیادہ میل جول نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے اس بات کا بھی علم ہو چکا تھا کہ سینما کے سارے ملازم درپردہ مجھ سے جلتے ہیں اور اکثر میری مخالفت کرتے ہوئے مجھ پر منیجر کے دلال ہونے کا بہتان لگاتے ہیں۔ پرسی کہا کرتا۔

"دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ تم ایمانداری سے اپنا کام کئے جاؤ۔ ان لوگوں کو بکنے دو۔"

شراب میں نے کبھی نہیں پی تھی۔ مگر سینما کے منیجر نے دو ایک بار مجھے بھی زبردستی پلا دی۔ ایک بار میں کمرے میں حسب معمول جام مینا سجا کر باہر نکلنے لگا تو منیجر ایک نٹ کھٹ عیسائی لونڈیا کو بغل میں دبائے اندر داخل ہوا۔ یہ عورت بڑی صحت مند اور جوان تھی اور اتنی خوبصورت تھی کہ ہمارا منیجر اس کے سامنے بھنگی دکھائی دے رہا تھا۔ عورت نے اندر داخل ہوتے ہی تپائی پر شراب کی پوری بوتل کو دیکھا تو پرس پلنگ پر پھینک کر نعرہ لگا کر بولی:۔

"اخاہ! شیمپین! او گاڈ۔ تم کتنے ونڈرفل ہو۔"

منیجر نے مجھے برف توڑ کر تھرمس کی بجائے پلیٹ میں ڈالنے کو کہا۔ میں برف توڑ کر اسے بڑی پلیٹ میں رکھنے لگا۔ منیجر نے اس دوران میں بوتل کھول کر اس کے دو جام

بھرے۔ ایک خود پیا اور ایک اس عورت کو دیا۔ تیسرا جام بنا کر اس نے میری طرف بڑھایا۔

"یہ لو۔ اسے تم پی جاؤ اور کچھ غم نہ کرو۔"

میں نے مسکرا کچھ شرما کر انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں شراب نہیں پیا کرتا۔ اُس عورت نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"ارے بشمین نہیں پی رہے۔ تم کتنے ڈرپی آدمی ہو۔ یہ لو پی جاؤ۔"

میں نے معذرت چاہی تو منیجر نے ڈانٹ کر کہا۔

"ارے بیٹا ہے یاد دوں ایک جھانپڑ۔ پی جا اسے۔ کم بخت میری معشوقہ کی توہین کر رہا ہے۔"

میں نے جام لے کر ہونٹوں سے لگا لیا اور بمشکل ایک گھونٹ پیا۔ میرا حلق کسیلا ہو گیا۔ منیجر نے زبردستی باقی شراب بھی پلا دی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ میں باہر آ کر سٹول پر پہرہ دینے بیٹھ گیا۔ شراب کا خوشگوار سا نشہ چڑھنے لگا۔ پہلے تو اس کا ذائقہ بڑا برا لگا تھا۔ اب حلق شیریں ہو گیا اور دماغ ہلکا ہو کر اڑنے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ سگریٹ کا اس سے پیشتر کبھی اتنا مزہ نہ آیا تھا۔ میں اُوپر تلے دو سگریٹ پی گیا۔ دل مزید شراب پینے کو چاہنے لگا۔ میں نے دروازے کے سوراخ میں سے اندر دیکھا۔

انہوں نے ابھی کپڑے نہیں اتارے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں لیٹے ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو شراب کے جام پلا رہے تھے۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ اس قدر ہلکا محسوس ہوا جیسے میں نے غبارہ ہاتھوں میں تھام لیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے اندر سے دروازہ کھولا۔ میں سٹول پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ منیجر نے مجھے اندر بلایا۔

"دچوک پر جا کر بکرے کے بھُنے سولہ تکے لے آؤ۔"

اس نے جیب میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیا۔ میں چوک میں گیا۔ برسات کے دن تھے۔ رات بارش ہوتی رہی تھی۔ بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے۔ سڑک کے کنارے کنارے کہیں کہیں کیچڑ ہو رہی تھی۔ تکے بنوا کر میں جھٹ سے اوپر آ گیا۔ ٹھنڈی ہوا نے میرے خمار کو تیز کر دیا تھا۔ نشہ زیادہ نہیں تھا۔ ایک خوشگوار کیفیت تھی

جس نے میرے دل و دماغ پر چھا کر مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا اور میں اپنے آپ فضا میں اڑ رہا تھا۔ تکے لا کر میں نے پلیٹ میں رکھ دیئے۔ عیسائی عورت نے دھڑا دھڑ گوشت کھانا شروع کر دیا۔ وہ بہت پی گئی تھی۔ اور اسے کافی نشہ ہو رہا تھا۔ منیجر ایسے موقعوں پر خاص طور پر زیادہ نہیں پیا کرتا تھا بلکہ اس کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت ہی زیادہ چڑھ جائے۔

عورت کے بال کھلے تھے اور دو لٹیں ماتھے پر پڑیں بجلی کے پنکھے کی ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں اور وہ ایک ہاتھ سے بار بار اپنی چھاتی مسل رہی تھی۔ میں چپکے سے باہر نکل گیا۔ منیجر نے میرے پیچھے اُٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں نے اس کے ذرا بعد سوراخ پر آنکھ رکھ دی۔ اس کمرے کے آس پاس کبھی کوئی نہیں آیا تھا ایک تو یہ کمرہ دوسری منزل پر ایک بڑی الگ جگہ پر تھا۔ دوسرے چونکہ سینما کے تمام ملازموں کو اس کمرے کی مصروفیات کا پوری طرح علم تھا اس لئے ادھر کبھی کوئی نہیں آیا تھا چنانچہ میں بڑے اطمینان سے ساتھ سوراخ میں سے یہ تماشہ دیکھا کرتا۔ بھنے ہوئے تکے کھانے کے بعد عورت نے ایک جام اور بنا کر حلق میں انڈیلا اور کالے بھجنگ منیجر کی گردن میں اپنے سُرخ و سپید بھرے بھرے بازو ڈال دیئے۔ منیجر کی لال لال شنگرفی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے اپنا منہ اور تیشے ایسی ناک عورت کی چھاتیوں کے درمیان بھڑا دی۔ عورت ہلکی سی چیخ مار کر الگ ہو گئی اور ہنسنے لگی:۔

"تم میرا اسکرٹ خراب کر رہے ہو۔"

"اسے اتار کیوں نہیں دیتیں؟"

"اوئی......"

اور اس کے ساتھ ہی عورت نے پلک جھپکنے میں سکرٹ اتار کر پرے پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے زیر جامہ بھی اتار دیا۔ مجھے اس عورت کے پیٹ اور بغلوں میں سنہری بالوں کے گچھے نظر آئے۔ جو مجھے بڑے مکروہ لگے۔ منیجر اس کے آگے دو زانو ہو گیا اور اپنا منہ اس کے پیٹ پر رکھ دیا۔ مجھے متلی ہونے لگی۔ میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور سگریٹ

جلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ ایک گھنٹے بعد جب عورت کمرے سے باہر نکلی تو اس پر کسی مسلے ہوئے پھول کا گمان ہوتا تھا۔ اگرچہ اس نے ٹھنڈا چشمہ لگا رکھا تھا اور بالوں میں کنگھی کر رکھی تھی۔ پھر بھی اس کی سُرخ گالوں پر بوسہ بازی کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے اور چال میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔ منیجر پورے ہوش میں تھا۔ اس نے پچھلے دروازے سے نکل کر اس عورت کو گاڑی میں بٹھلایا اور بڑے مہذب طریقے سے سلام کرکے رخصت کر دیا۔ میں نے کمرے میں جا کر دیکھا۔ بوتل خالی ہو چکی تھی۔ خالی گلاس زمین پر پڑے تھے۔ بھنے ہوئے تکے ویسے کے ویسے پڑے تھے اور ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ پلنگ کی چادر ایک طرف سمٹی سمٹائی پڑی تھی۔ فرش پر یہاں وہاں ادھ پیئے بجھے ہوئے سگریٹ بکھرے پڑے تھے۔ میں نے خالی بوتل اور گلاس اٹھا کر الماری میں رکھے۔ پتائی صاف کی۔ چادر اٹھا کر حسب عادت دراز میں رکھ دی۔ فرش صاف کیا۔ کھڑکیاں کھول دیں۔ پنکھا بند کیا اور دروازے پر تالا لگا کر نیچے آگیا۔

برسات ختم ہو گئی تھی اور رات کو ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی تھی۔ میں اور پرسی اب رات کو کوٹھڑی کے اندر سوتے تھے۔ کیونکہ پچھلے پہر اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ ان ہی دنوں منیجر کسی کام کے سلسلے میں دو روز کے لئے راولپنڈی گیا۔ اسے گئے ایک دن ہی ہوا تھا کہ گلو گیٹ کیپر نے مجھے ایک طرف بلا کر بڑی عاجزی سے کہا۔

"یار! آج اگر تم میرا ایک کام کر دو تو تمہارا جواب نہیں۔"

کام یہ تھا کہ سینما ہال میں ایک مشتبہ عورت بیٹھی فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی اور اس کے پاس سوائے ایک چھوٹی سی بغچی کے اور کچھ نہ تھا۔ گلو ہر عورت پر نگاہ رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ عورت فاحشہ ہے اور اسے شو ختم ہونے کے بعد بڑی آسانی سے پھانسا جا سکتا ہے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ میں شو ٹوٹنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے منیجر کا اوپر والا کمرہ کھول دوں۔ میں نے کہا۔

"تم اسے بکس میں کیوں نہیں لے جاتے؟"

گلو بولا:۔

"یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہر بکس کی اندر والی

کنڈیاں توڑ دی گئی ہیں اور چھوٹا منیجر سالا وقت بے وقت ہر بکس میں منہ ڈال کر جھانکا کرتا ہے۔"

میں نے کہا:۔

"اور اگر اس کی منیجر کو خبر ہو گئی تو جانتے ہو مجھے نوکری سے جواب مل جائے گا۔ پھر اس کا کون ذمہ دار ہے۔"

گلو نے کچھ لجاجت اور کچھ اپنی روایتی اکڑفوں کو برقرار رکھتے ہوئے کہا:۔

"ہم تمہارے لیئے جان بھی دے سکتے ہیں پہلوان اور تم ہمارا اتنا سا کام نہیں کر رہے۔ میں کہتا ہوں جب سوائے ہم دونوں کے اور کسی کو خبر نہ ہوگی تو منیجر کو کیسے پتہ چلے گا۔ اور پھر اس دعوت میں تمہارا بھی تو حصّہ ہوگا۔"

"میرے حصّے کی بات تم چھوڑ دو۔"

"کیوں کیا تم مرد نہیں ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ گلو بڑا خوش ہوا اور میرا ہاتھ دبا کر اتنا کہہ کر گیٹ پر جا کھڑا ہوا۔

"تم یہیں رہنا۔"

دراصل مجھے نامردی کے طعنے پر طیش آگیا تھا۔ اور میں گلو کو بتا دینا چاہتا تھا کہ میں نامرد نہیں ہوں بلکہ اس کی طرح کا مرد ہوں جو عورت کو اس کا پورا پورا حق دے سکتا ہے۔ شو ختم ہوا تو گلو گیٹ کھول کر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگ باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ سب سے آخر میں کچھ عورتوں کے ساتھ ایک عورت باہر نکلی۔ اس نے نسواری رنگ کا سیدھا برقعہ پہن رکھا تھا اور بغل میں کچھ اٹھا رکھا تھا۔ گلو نے مجھے آنکھ ماری اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے جھک کر بولا:۔

"میں اسے پھنسا کر لاتا ہوں۔ تم اوپر والا کمرہ کھلا رکھنا۔"

میں نے اوپر آکر چپکے سے کمرہ کھول دیا۔ اس کی ساری کھڑکیاں بند کر دیں۔ پلنگ پر سے صاف دھلی ہوئی چادر اٹھا کر دراز میں رکھ دی۔ کمرے کا دروازہ بند کیا اور سیڑھیوں

کے اوپر کھڑے ہو کر گلو کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ یہ سب کچھ میری منشا اور خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں ان تمام عورتوں کی عریاں تصویریں گھوم رہی تھیں جنہیں میں نے شراب کے نشے میں چھوٹے منیجر کے ساتھ خرمستیاں کرتے دیکھا تھا اور میں اس نسواری برقعے والی عورت سے ان تمام عورتوں کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ جنہیں میں اپنی آغوش میں نہیں لے سکا تھا اور جو مجھے دور ہی دور سے تڑپا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر سیڑھیوں کے اوپر دالان میں ٹہلنے کے بعد میں نیچے آ گیا اور سینما کے بڑے دروازے کے باہر سگریٹ والے کی دکان پر کھڑا ہو گیا۔ باتیں پنواڑی سے کر رہا تھا اور نگاہیں سڑک پر لگی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ گلو اپنی مہم میں کامیاب ہو کر لوٹے گا۔ وہ اس میدان کا بڑا آزمودہ سپاہی تھا اور ہمیشہ فتح یاب ہوتا رہا ہے۔ اور میری بات بالکل سچ نکلی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہی نسواری برقعے والی عورت گلو کے ساتھ سینما کی طرف واپس آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پنواڑی سے پان لے کر منہ میں ڈالا۔ میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ میں اوپر آ گیا اور کمرے کے باہر بے چینی سے چکر لگانے لگا۔

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔

میں نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ نسواری برقعہ اوپر آ رہا تھا۔ عورت اوپر آ کر جنگلے کے پاس رک گئی۔ میں نے بولنا چاہا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔

"اندر — اندر آ جاؤ"

وہ عورت چپکے سے اندر آ گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور گلو کا انتظار کرنے لگا میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اتنے میں گلو گیٹ کیپر آ گیا۔ وہ بوکھلایا ہوا سا تھا اور اس نے ہاتھ میں ایک لفافہ تھام رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی سرگوشی میں پوچھا

"مال کہاں ہے؟"

مجھے یوں لگا جیسے وہ بھیڑ بکریوں کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ میں نے بڑا

ہوشیار بننے کی کوشش میں آنکھ کے اشارے سے کہا۔

" اندر ہے "

گلو نے زبان خشک ہونٹوں پر پھیر کر کہا:۔

" خیر ہووے ـــ تم باہر ہوشیار رہنا "

اتنا کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اب مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے بڑا غلط قدم اٹھایا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر مجرم ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا خیال بھی تھا کہ گلو کب باہر نکلے گا۔

مجھے اس سوراخ کا خیال آیا جس میں سے میں خوفناک نظارے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے سٹول پر بیٹھ کر اندر دیکھا کہ گلو اس عورت کے ساتھ پلنگ پر بیٹھا ہے اور لکڑبگڑ کی طرح اپنے بھالوؤں ایسے بازو ہلا ہلا کر اس عورت کو لفافے میں سے آم نکال کر دے رہا ہے۔

" اری آم تو کھا لے۔ یہ تمہیں کاٹتے ہیں کیا؟ "

عورت نے برقعہ اتار رکھا تھا۔ اس کی بغچی تپائی پر پڑی تھی اور وہ چھوٹی موئی سی بن کر پلنگ کے ایک طرف لگی بیٹھی تھی۔ میں نے اس پلنگ پر ہمیشہ قہقہہ لگاتی، پرجوش انداز میں بوسہ بازی کرتیں اور وقتی تعیش کے مزے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی عورتوں کو ہی دیکھا تھا یہ پہلی عورت تھی جو گٹھڑی سی بن کر پڑی تھی اور گلو ایسے دیو قامت انسان سے بھی اپنی جگہ سے ہلائی نہیں جا رہی تھی۔ پہلے تو وہ عورت گلوؔ کا ہاتھ جھٹک دیتی۔ پھر جب گلوؔ کی دست درازیوں میں اس کی بے پناہ جسمانی قوت بھی شامل ہو گئی تو مجبور عورت بے بس ہو کر رو پڑی۔

گلوؔ نے ایک لپڑ رسید کر دیا۔

" حرامزادی ہمیں اب رو کر دکھاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ عیش کرتی ہے اور ہمارے سامنے ٹسوے بہاتی ہے؟ اتار کپڑے تیری ماں ...... "

عورت جھکرا سی گئی اور اس نے جلدی سے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے اُٹھ کر زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ دروازہ کھلا تو

ہانپتا ہوا گلو میرے سامنے کھڑا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے ؟"

میں نے غصّے میں آکر کہا:

"تم اس عورت کو ناجائز تنگ کر رہے ہو۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔"

گلّو نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا اور سانس درست کر کے مجھے سمجھانے لگا۔

"تم دیوانے ہو گئے ہو کیا ؟ تمہیں کیا خبر یہ ایک چھنال عورت ہے۔ بات ساری یہ ہے کہ وہ مجھ سے بیس روپے معاوضہ مانگ رہی تھی جو میں نے نہیں دیا ارے میں تو اسے چار غنڈوں سے چھڑا کر لایا ہوں وہ تو پیشہ ور ٹیکسی ہے تم ان عورتوں کو ابھی نہیں جان سکتے۔ بھلا کبھی شریف عورتیں بھی اس طرح کھلے بندوں بنچی اٹھائے فلم دیکھنے آتی ہیں۔ میں نے سنیما میں یونہی تو عمر ضائع نہیں کی۔ بس اب چپکے ہو کر بیٹھے رہو اور کسی کو اندر مت آنے دینا۔ میرے بعد تمہاری باری ہو گی۔"

میں خاموش ہو رہا اور گلو نے کمرے میں گھسنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ شاید گلو ٹھیک ہی کہتا ہو۔ بھلا شریف عورت کو اس طرح آوارہ گردی کرنے کی کیا پڑی ہے۔ یہ عورت یقیناً فحاشہ ہے اور محض روپے بٹورنے کی خاطر گھر سے نکلی ہے۔ میں مطمئن ہو کر سٹول پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

ایک پل کے لئے مَیں نے دروازے کے سوراخ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ گلّو اس عورت کے ساتھ لیٹا پلنگ پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ عورت بدمعاش ہے اور دکھاوے کا رونا رو رہی تھی۔ اب میں بڑی بے تابی کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ میرا جسم آگ بھبوکا ہو کر دہک رہا تھا اور ٹانگوں میں گویا لوہے کی سلاخیں تپ رہی تھیں۔ دل کنپٹیوں کے پاس آکر دھڑ دھڑا رہا تھا۔ سگریٹ حلق میں کڑوا لگ رہا تھا۔ اور زبان خشک ہو رہی تھی۔ میں نے سگریٹ پھینک دیا۔ دوسرا شو شروع ہو چکا تھا اور سینما حال کے اندر سے ہیروئن کے پہلے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے اس حالت میں

پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک لم تڑانگ بلّا اپر پیڑ سیڑھیوں میں نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی مسکرا کر میری طرف دیکھا اور دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا:۔

"کیوں بھئی غسل خانہ خالی ہوا ہے یا نہیں؟"

میں نے بڑا بھولا بن کر پوچھا:

"کیا مطلب؟"

بلّے نے چٹکی بجا کر سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے کہا:۔

"کیوں بھولے بن رہے ہو میاں۔ بلّا سب جانتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ بہتی گنگا میں سے ہمیں بھی چو تخ بھر لینے دو۔ نہیں تو تم سب کی کھیر بنا دوں گا"

اس کے ساتھ ہی اس نے زور سے دروازہ اندر کو دھکیلا۔ گلو باہر نکل آیا۔ اس کا رنگ ہلدی ایسا ہو رہا تھا۔ سانس چڑھی ہوئی تھی اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ وہ بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے سلجھا رہا تھا۔

"کیا طوفان آ گیا ہے؟"

بلّا مسکرا کر بولا

"طوفان کیا آنا ہے پہلوان مشین گرم ہے ایک نیوز ریل ہمیں بھی چلا لینے دو"

گلو نے پریشان ہو کر کہا:۔

"تمہاری بہن کو...... کوئی آ گیا تو ہم سب جیل کی ہوا کھا رہے ہوں گے"

"پہلوان جیل تو جائیں گے ہی پہلے ذرا عدالت میں حاضری دے آئیں"

اتنا کہہ کر وہ دھن دھناتا ہوا اندر گھس گیا۔ اور دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ گلو نے پشیمان سا ہو کر مجھے دیکھا:۔

"یار اب بتاؤ میں کیا کروں۔ اس بہن کے یار کو کون روک سکتا ہے۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ گیٹ پر مولوی کو کھڑا کر کے آیا تھا۔ جب یہ بھوت باہر نکلے گا تو تم اپنا کام کر لینا اور اس کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لینا۔ اچھا......"

گلو بال ٹھیک کرتا، قمیض کی سلوٹیں درست کرتا وہاں سے چلا گیا۔ اب میں ایک بار دربانی کرنے کو اور اپنی باری کا انتظار کرنے کو اکیلا رہ گیا۔ میرا خون کھول رہا تھا کہ ان لوگوں نے میری مہربانی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو ان لوگوں کا کیا جائے گا۔ نوکری سے جواب تو مجھے ملے گا۔ میں نے غصّے میں آکر سوراخ میں سے اندر دیکھا اور بھونچکا سا گیا۔ اونٹ نما بلے آپریٹر نے اس عورت کو الف ننگا کر کے اپنے کندھوں پر بٹھلایا ہوا تھا اور بھالو کی طرح کمرے میں اِدھر اُدھر ناپ رہا تھا۔ میں نے زور سے دروازے پر ہاتھ مارا۔ اندر سے بلے نے آواز دی۔

"کیا ہے بے؟ تم سے صبر نہیں ہو رہا؟ ابھی آتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے عورت کو کندھے سے اتار کر پلنگ پر گرا دیا اور بولا:۔

"لو میری ہتھنی بمبئی کی سیر ہو گئی اب ذرا تمہاری کھیر بنا دی جائے۔"

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ میں جلدی سے جنگلے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے یہ عقل مندی کی تھی کہ دروازے کے باہر تالا لگا دیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بدمزاج چھوٹا منیجر اوپر آ رہا ہے۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹین کے گول ڈبے میں بند فلم کی ایک ریل تھی۔ اوپر آکر اس نے مجھے دیکھا تو غصّے میں آکر بولا:۔

"سالا تم یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ سارا سینما چھان مارا اور تم یہاں کھڑے جھک مار رہا ہے دروازہ کھولو۔"

میری زبان سوکھ گئی اور بدن لرزنے لگا۔ چھوٹے منیجر نے گرج کر کہا:۔

"دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟"

میں نے فوراً ہی اس پر قابو پا کر کہا:۔

"جی چابی میرے پاس نہیں صاحب۔"

"تو پھر کس کے پاس ہے؟ منیجر صاحب تمہیں دے کر نہیں گئے تھے۔"

"جی دے گئے تھے۔"

"پھر کہاں ہے؟"

"جی میں نے گھر پر رکھی ہوئی ہے"

"کیوں یہ تیرے باپ کا کمرہ ہے جو چابی گھر پر رکھ چھوڑی ہے اب یہ ریل تمہاری ماں کے سر میں رکھوں؟ حرامزادے حرام کی کھا کھا کر چربی چڑھا لی ہے"

اس کے ساتھ ہی اس بدفطرت نے اس زور سے میرا کان مڑوڑا کہ میری چیخ نکل گئی۔

"اگر شام کو چابی نہ لائے تو تمہیں ڈس مس کر دوں گا۔ سمجھے۔ حرام خور! پاجی ـــ گھر سے نوکری کرنے آجاتے ہیں"

وہ ریل واپس لے کر نیچے اتر گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں جانتا تھا وہ میرے خلاف ہے اور مینیجر کا چہیتا چپڑاسی ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے خار کھائے بیٹھا ہے۔ آج اس کو موقع مل گیا تھا اور اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تھی۔ لیکن میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا سر سے ٹل گئی۔ اتنے میں دروازہ اندر سے کسی نے بجایا۔ میں نے جلدی سے قفل کھول دیا۔ ہلا باہر نکل آیا۔

"جا بیٹا تو بھی اپنی ریل چلالے۔ فس فل کلاس ہے۔ اے سی۔ ڈی سی دونوں طرح سے چلتی ہے"

اور وہ ہنستا جھومتا اپنے کیبن کی طرف گھوم گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اندر جاؤں یا اس عورت کو باہر نکال کر تالا لگا دوں اور اس مصیبت سے نجات حاصل کروں دل نے کہا اس بک بک کو چھوڑو۔ بھاڑ میں جائے یہ عورت۔ اسے باہر نکالو اور کمرہ بند کردو۔ پھر خیال آیا شاید ایسی عورت پھر زندگی میں کبھی نصیب نہ ہو۔ مجھے ایک ایک کرکے صوفی ہوٹل کے سارے فحش مناظر یاد آنے لگے۔ میرا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ میں نے دروازہ کھولا اور دوسرے لمحے اندر کمرے میں کھڑا تھا۔

اس عورت نے کپڑے پہن لئے تھے اور ایک ہاتھ میں برقعہ اور دوسرے ہاتھ میں اپنی جوتی اٹھائے کونے میں سہمی ہوئی سی کھڑی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ ناک بھی سُرخ

نگینے والی دیہاتی عورتوں والی کیل تھی۔ جسم دبلا پتلا تھا اور آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر وہ کچھ اور سمٹ گئی۔ میں پہلے تو شرما گیا۔ پھر سوچا اس قسم کی عورتوں کے ساتھ شرم وحیا سے کام لینا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہوتا ہے۔ یہ عورتیں اس قسم کے سلوک کی عادی نہیں ہوتیں۔ وہ یقیناً مجھے نامرد سمجھ بیٹھے گی۔ خفت الگ ہوگی اور موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا میں نے اپنے اندر مصنوعی اعتماد پیدا کر کے ہاتھ بڑھا کر اس کی بقچی چھین کر پائی پر رکھ دی۔

"ہم سے پیار کئے بغیر کہاں جا رہی ہو؟"

اس عورت نے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا:۔

"خدا کے لئے مجھے جانے دو۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے جانے دو۔"

مجھ پر اس کی منت سماجت کا فوری طور پر اثر ہو گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کل کلاں یہ عورت کسی جگہ مل گئی تو یقیناً میرا مذاق اڑائے گی اور سہیلیوں سے کہے گی۔

"میں نے اس آدمی کو الو بنایا تھا۔"

میرے احساس مردانگی کو اس خیال سے زبردست مہمیز لگی۔ اور میں نے اس کے ہاتھ سے برقعہ بھی چھین لیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پلنگ پر گرا دیا۔

"میں تم ایسی عورتوں کے سب فریب جانتا ہوں۔ اب سیدھی طرح سے راہ راست پر آجاؤ۔ نہیں تو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ میں تمہیں چور کہہ کر ابھی پکڑوا دوں گا اور ٹھنڈے ٹھنڈے جیل کی ہوا کھاتی پھرو گی۔"

عورت کا رنگ زرد ہو گیا۔ چہرہ سمٹ کر چھوٹا سا ہو گیا۔ مجھے اس کی گردن اور گال پر دانتوں کے نشان دکھائی دیئے جس نے میری آتش ہوس کو مزید تیز کر دیا۔ اس نے قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"اگر میری طرح تمہاری بہن کو کوئی گھر سے بھگا کر شہر میں لا کر چھوڑ دیتا تو تم میرے ساتھ یہ زیادتی نہ کرتے۔"

میں نے اپنا ہاتھ روک لیا اور حیرت سے پوچھا:۔

"کیا مطلب؟"

اس کے بعد اس عورت نے زار و قطار روتے ہوئے مجھے رام کہانی سنا ڈالی۔ وہ اوکاڑہ کی رہنے والی تھی اور کسی سبزی فروش کی بیٹی تھی۔ اس کی دوستی اپنے محلے میں ایک بہشتی کے لونڈے سے ہو گئی۔ پہلے تو دونوں محلے میں ہی چھپ چھپ کر راتوں کو ملتے رہے۔ پھر اس لونڈے نے اسے سبز باغ دکھانے شروع کر دیئے اور ترغیب دی کہ اس کے ساتھ لاہور بھاگ چلے۔

"لاہور جا کر میں تم سے شادی کر لوں گا۔ میں ریلوے میں نوکر ہو جاؤں گا۔ وہاں میری بڑی واقفیت ہے ہم ریلوے کوارٹروں میں رہیں گے اور عیش کریں گے۔"

عورت عام طور پر محبت میں دیوانی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی اس کی باتوں میں آ گئی اور سونے کی دو چار چیزیں اور کچھ جمع پونجی لے کر اس لونڈے کے ساتھ اپنے گھر سے بھاگ نکلی۔ لاہور آ کر انہوں نے سٹیشن کے قریب ایک جگہ قیام کیا۔ بہشتی کے لونڈے نے لڑکی کے زیور بیچ بیچ کر کھانے شروع کر دیئے۔ جب روپیہ ختم ہو گیا تو عورت کو مارنے پیٹنے لگا اور اسے مجبور کیا کہ وہ جسم فروشی شروع کر دے۔ سبزی فروش کی لڑکی نے انکار کیا تو اسے دو روز تک کوٹھڑی میں بھوکی پیاسی ڈال رکھا۔ تیسرے روز اسے باہر نکال کر کچھ کھانے کو دیا وہ بھوک سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے مالک کی بات مان لی اور پیشہ کروانا شروع کر دیا لیکن ابھی شرافت کے سوراج کو پورا گرہن نہیں لگا تھا۔ ایک ہی مہینے میں وہ اس شرمناک زندگی سے عاجز آ گئی۔ اس نے ایک روز اپنی بقچی اٹھائی اور اس گناہ کی دلدل سے نکل بھاگی دن بھر وہ شہر کی سڑکوں پر آوارہ پھرتی رہی۔ کئی لوگ اس کے پیچھے لگے رہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ واپس گھر کس منہ سے جائے۔ لیکن پیچھا کرنے والے اوباش اسے سوچنے کی مہلت بھی نہ دے رہے تھے۔ تنگ آ کر اس نے سینما کا ٹکٹ لیا اور ہال میں جا بیٹھی۔ اس خیال سے کہ وہاں اطمینان سے دو گھڑیاں بیٹھ کر وہ اپنے مستقبل پر غور کر سکے گی۔ لیکن یہاں گلو گیٹ کیپر نے اسے اپنے دام میں پھنسا لیا۔

اس بے بس عورت کی داستان سن کر میں لرز گیا۔ میں نے پلنگ پر سے اٹھ کر اسے برقعہ پکڑا دیا۔

"اسے پہن لو۔"

اس نے جلدی سے برقعہ پہنا۔ بقچی اٹھائی اور باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

"تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟"

"صرف پانچ روپے ہیں۔"

"تم نے کیا سوچا ہے۔"

"میں گھر واپس کس منہ سے جاؤں"

"لیکن گھر کے سوا تمہارا اور ٹھکانہ بھی کہاں ہو گا؟ تم رات کہاں بسر کرو گی۔ تمہیں وہ بہشتی لونڈا نہیں تو کوئی اور جہنمی پکڑ لے گا اور اسی دلدل میں دھکیل دے گا۔ جہاں سے تم عمر بھر نہ نکل سکو گی۔ ابھی وقت ہے۔ ابھی تم واپس جا سکتی ہو۔"

اس نے پلّو سے آنکھ میں آیا ہوا آنسو خشک کرتے ہوئے کہا:۔

"گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے کا حوصلہ نہیں پا رہی۔"

"میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

اس نے تعجّب اور حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی:۔

"تم چلو گے؟ ڈرتی ہوں کہیں تم بھی تو مجھے دھوکا نہیں دے جاؤ گے کہیں تم بھی تو دوسروں کی طرح مجھے کسی اندھیرے غار میں دھکیل کر خود چلتے نہ بنو گے۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:۔

"یہ ٹھیک ہے کہ میں تمھیں اپنی نیک نیتی کا یقین نہیں دلا سکتا۔ تم میرے بارے میں جو بھی سوچو تمہیں ایسا سوچنے کا حق ہے۔ لیکن میں تمہارے لئے صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں اور اس کے بعد تمھیں

بھول جاؤں - زندگی کے اتنے بڑے میدان میں جہاں گھمسان کا رن پڑ رہا ہے - جہاں ہر آدمی تلوار سونتے دوسرے آدمی پر حملہ آور ہونے کو تیار بیٹھا ہے - دو آدمیوں کا پیار سے ایک دوسرے کو گلے لگانا بڑی تعجب کی بات ہے - پھر بھی سچائی اپنی معمولی سے معمولی حیثیت میں ضرور زندہ رہتی ہے - تار کتنا زنگ آلود کیوں نہ ہو جائے - اس کے نیچے چمکتا ہوا پیتل ضرور موجود ہوتا ہے صرف اسے کپڑے سے رگڑنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ عورت میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی - میں اسے لے کر اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ شام کو میں نے پرسی کو ساری بات سنا ڈالی - پرسی بھی اس بدنصیب عورت کی داستان سے بڑا متاثر ہوا۔ رات کو وہ عورت ہماری کوٹھڑی میں ہی سوئی - میں اور پرسی ایک چارپائی پر آنگن میں سوئے اور عورت کوٹھڑی میں اکیلی سوئی - آدھی رات کے بعد پرسی کی آنکھ کھل گئی میں پہلے ہی سے جاگ رہا تھا - اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا :-

"یار میری نیت اس عورت پر خراب ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا :-

"نیت میری بھی ڈانواں ڈول ہو رہی ہے۔"

وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا -

"پھر کیا خیال ہے ؟"

میں نے کچھ سوچ کر کہا :-

"نہیں پرسی - یہ بات اچھی نہیں - ہم خراب سوچ رہے ہیں - یہ بری بات ہے - یہ عورت ہم دونوں پر اعتماد کر کے بے فکری سے اندر سو رہی ہے - جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ عورت نیک ہے اور اسے خراب کیا گیا ہے - سو جاؤ پرسی سو جاؤ - اپنے قبضے میں آئی ہوئی عورت سے زبردستی بدکاری کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی کچھ کھا کر مر جائے - یہ برا

ہے پرسی۔ اسے بھول جاؤ۔ تم بھی اپنے اوپر جبر کر کے سو جاؤ اور میں بھی اپنے اوپر جبر کر کے سونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

پرسی نے گہرا سانس لیا۔ اٹھ کر پیشاب کیا۔ کھاٹ پر آ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ سو نہیں رہا۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ دماغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ سارا بدن دکھ رہا تھا۔ نگاہ بار بار کوٹھڑی کے بند دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ کان اندر کی آوازوں پر لگے تھے۔ وہ عورت ذرا کھاٹ پر پہلو بدلتی۔ چارپائی چرچراتی تو ہمارے حلق خشک ہو جاتے اور دل کہتا کہ اُٹھ کر دروازہ توڑ دو اور اندر گھس جاؤ۔

ساری رات ایسے ہی گزر گئی۔ پچھلے پہر کسی وقت مجھے نیند آئی۔ دن نکلا تو میں قلندر ہوٹل سے مکھن اور چائے بند لے آیا۔ ہم تینوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ عورت نے منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں کنگھی کی۔ اس کے بال کالے تھے اور بڑے باریک اور لمبے لمبے تھے۔ میں نے سینما سے چھٹی لے رکھی تھی اور دفتر سے دس روپے بطور پیشگی بھی لے لئے تھے۔ میں نے ملیشئے کی پتلون چپل اور قمیض پہنی اور اس عورت کو ساتھ لے کر بسوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہماری بس ادکاڑہ شہر کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ راستہ بھر سوچتا رہا کیا میں اتنے بڑے کام کو سر انجام دے سکوں گا؟ ایک معمولی چپڑاسی ہوں۔ بھلا میری بات کا اعتبار کون کرے گا۔ پھر سوچتا۔ سچائی اونچ نیچ سے بے نیاز ہوتی ہے۔ سچی بات ہر حالت میں اثر کرتی ہے۔ اگر میں سچائی پر ہوں تو میری بات کا اثر ضرور ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ عورت جو نسواری برقعہ اوڑھے اور بقچی گود میں رکھے اگلی سیٹ پر بیٹھی ہے بے گناہ ہے اور میرا ایمان ہے کہ بے گناہ عورت کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ بس سڑک پر تیزی سے اڑی جا رہی تھی۔ درخت اور کھیت اور کچے مکانوں والے چھوٹے چھوٹے گاؤں پیچھے بھاگ رہے تھے۔ جوں جوں منزلِ مقصود قریب آ رہی تھی میرے ارادے متزلزل ہو رہے تھے اور محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس عورت کے ماں باپ کو قائل نہ کر سکوں گا۔

اوکاڑہ آگیا۔ وہ عورت مجھے ساتھ لے کر ایسے علاقے میں آگئی جہاں کچے پکے جھنجھلے چھجوں اور بینگے ٹیڑھے دروازوں والے مکان ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ ایک تنگ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا:۔

"میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اگر میرے باپ نے مجھے معاف نہ کیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا:۔

"خدا پر بھروسہ رکھو۔ تم سچائی پر ہو۔ تم بری زندگی کو چھوڑ کر اچھی زندگی کی طرف آرہی ہو۔ خدا تمہاری ضرور مدد کرے گا۔"

"کیا تم میرے ماں باپ کو قائل کر لو گے؟"

"میں کوشش کروں گا۔ باقی جو خدا کو منظور رہے وہی ہوگا۔"

ایک مکان کے آگے کھڑے ہو کر اس نے کہا:۔

"یہ ہمارا مکان ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔"

وہ مکان کے اندر داخل ہوگئی۔ مکان خستہ تھا۔ دروازے کی چوکھٹ ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ اور میلا کچیلا سا بوریا لٹک رہا تھا۔ میں باہر گلی میں کھڑا رہا۔ اس عورت کے گھر میں داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے برتن گرنے اور پھر کسی مرد کے گرجنے کی آواز آئی۔ پھر یوں لگا جیسے دھما دھم کسی کی ٹھکائی ہو رہی ہے اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی۔ میں گھبرا سا گیا۔ دل نے کہا یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تم خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ پھر سوچا یہ بزدلی ہے یہ بات مردانگی کے خلاف ہے کہ میں جو اپنی شہادت سے ایک بے بس عورت کو سنگین جرم سے بچا سکتا ہوں یوں بے سہارا چھوڑ کر اپنی راہ لوں۔ میں نے بگلے کا سگریٹ جلایا اور اس کے کش لیتے ہوئے مکان کے پاس ہی ایک پھٹے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں مکان کا بوریا اٹھا۔ ایک مریل سا ادھیڑ عمر آدمی نمودار ہوا۔ آنکھوں میں کچھ نفرت، کچھ لجاجت، کچھ شرمندگی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر آنے کو کہا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

میں نے سگریٹ نالی میں پھینکا اور خدا کا نام لے کر بوریا اٹھا اندر داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں سے گزر کر ایک کچا آنگن آ گیا۔ دائیں بائیں دو نیم تاریک کوٹھڑیاں تھیں۔ ان کے باہر دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ بائیں جانب چولہا بنا تھا۔ طاق میں برتن لگے تھے ایک ادھیڑ عمر کی پریشاں حال عورت پلنگڑی پر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مریل سا آدمی چارپائی پر ایک طرف آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ مل رہا تھا اور زمین کو گھور رہا تھا۔ دوسری کھاٹ پر لسواری برقعہ اور بغچی پڑی تھی اور ایک کوٹھڑی میں سے اس عورت کی ہچکیاں لینے کی آواز آ رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔"

اس آدمی نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ وہ بار بار تہمد کے پلو سے ناک پونچھ رہا تھا۔ کچھ دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔ وہاں حبس تھا۔ نیم تاریک دیواروں سے سیلن کی ٹھنڈی بو اٹھ رہی تھی۔ ایک مچھر بھن بھن کرتا میرے کان کے گرد چکر لگانے لگا۔ ادھیڑ عمر عورت نے درد بھری آواز میں کہا:۔

"بیٹا ہم تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اس لڑکی نے تو ہماری عزت خاک میں ملا دی۔"

میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا:۔

"ماں جی! خدا کے کام میں بندہ کیا دخل دے سکتا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ کی لڑکی ایک بہت بڑے جہنم میں گرتی گرتی بچی ہے۔ میرا یہ انسانی فرض تھا کہ میں بے گناہ اور معصوم عورت کو اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا دوں۔ اب آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ پرانی باتوں کو بھلا دیں اور اپنی بچی کو معاف کر دیں۔ اسے پھر سے اپنے سینے سے لگا لیں۔ وہ کسی کے بہکاوے میں آ گئی تھی۔ وہ دن کو راستہ بھولی تھی لیکن شام کو گھر آ گئی ہے۔"

مریل سے تہمد پوش آدمی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"اس سے تو یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو اچھا تھا۔ آج اس کا بھائی کویت

میں نہ ہوتا تو اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ ہائے ری قسمت۔ اس بڑھاپے میں یہ کلنک کا ٹیکہ لگوانا تھا۔"

معلوم ہوا اس عورت کا نام بالی ہے۔ میں نے بالی کے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بزرگوارم اب آپ پرانے زخم نہ کریدیں۔ ان تمام باتوں پر مٹی ڈالیں۔ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے ذلیل کر دے۔ جسے چاہے عزت دے دے۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ خدا نے آپ کو کسی نیکی کا اجر دیا ہے کہ آپ کی بچی پھر آپ کے گھر آ گئی ہے۔ ورنہ اگر یہ غلط آدمیوں کے ہتھے چڑھ جاتی تو آپ کی ساری نسل خراب ہو جاتی۔ پھر آپ اپنی بدنامی کو کسی طرح نہ چھپا سکتے تھے۔ لڑکیاں بھولی ہوتی ہیں وہ مردوں کی باتوں میں آ جاتی ہیں۔ قصور بالی کا نہیں بلکہ اس ذلیل مرد کا ہے جو اسے بہکا کر لے گیا۔ بچی کو معاف کر دیجئے۔ یہ بالی کی نیک دلی ہی تھی جو اسے غلط راستے سے بھی اٹھا کر واپس اپنے ماں باپ کے پاس لے آئی۔ کوئی بری عورت ہوتی تو پھر کبھی گھر کا نام نہ لیتی اور آزادرہ کر جو من میں آتا کرتی پھرتی۔ ماں جی! آپ بھی بالی کو معاف کر دیجئے اٹھئے اور اپنی بچی کو سینے سے لگا لیجئے۔ خدا اسی میں خوش ہے۔ باقی دنیا والوں کا کیا ہے۔ وہ تو شریف سے شریف عورت میں بھی کیڑے ڈال دیتی ہے۔"

حیرت کی بات ہے کہ میری باتوں کا ان دونوں میاں بیوی پر بڑا اثر ہوا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے میری باتیں سنتے رہے اور جب میں نے بات ختم کی تو بوڑھے نے آہ بھر کر کہا۔

"اگر خدا کی یہی رضا ہے تو میں گناہ گار کیا کر سکتا ہوں۔ بالی کی ماں! اٹھو اور بالی کو باہر لے آؤ۔"

عورت نے بالی کو کوٹھڑی سے باہر لا کر چارپائی پر بٹھا دیا۔ بالی کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں اور اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ ماں نے اسے سینے سے لگا کر پیار کیا اور کہا۔

"اچھا بیٹی ہماری قسمت۔"

بالی کا باپ چپکے سے اٹھا اور صدری کندھے پر ڈال کر باہر نکل گیا۔ بیوی کے پوچھنے پر اس نے بجھی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی کہا۔

"دکان پر جا رہا ہوں۔ تم مہمان کے لئے کھانا تیار کرو۔"

میرا خیال تھا کہ میں آخری بس میں واپس لاہور آجاؤں گا۔ لیکن وہاں باتوں ہی باتوں میں شام ہوگئی۔ ریل گاڑی پچھلے پہر چار بجے چھوٹتی تھی۔ بالی کی ماں نے کہا۔

"بیٹا یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ رات یہاں آرام کرو۔ صبح پہلی بس پر لاہور چلے جانا۔"

چنانچہ میں رات وہیں رہ گیا۔ میرے لئے ایک چارپائی چھت پر ڈال دی گئی۔ روٹی کھا کر میں اُوپر جا کر لیٹ رہا۔ بڑا آرام دہ بستر نصیب ہوا تھا۔ یعنی صاف ستھرا کھیس، پھولدار تکیہ اور پچھلے پہر کی خنکی سے بچنے کے لئے ایک فوجی کمبل۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے جلد ہی نیند آگئی۔ ایسا گہری نیند سویا کہ جب آنکھ کھلی تو دن نکلا ہوا تھا اور اردگرد مکانوں کی منڈیروں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ میری چارپائی سیڑھیوں کے پاس ہی بچھی تھی۔ میں نے بالی کو دیکھا۔ وہ لوٹا ہاتھ میں لئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہی تھی۔ اُس نے بھی مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔

جب میں رخصت ہونے لگا تو بالی کے باپ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹا! ہم لوگ تیرا شکریہ کیسے ادا کریں۔ تجھے اس نیکی کا بدلہ خدا ہی دے گا اب یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ ہمیں بھلا نہ دینا۔"

بالی کوٹھڑی کے کیواڑ سے لگ کر کھڑی تھی۔ سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس وقت جو اداسی اس کے چہرے پر جھلک رہی تھی وہ بڑی دل کش تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی غمگینی صاف کہہ رہی تھی کہ اسے مجھ سے جدا ہونے کا بڑا ملال ہے۔ بالی کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا خدا کے حوالے بیٹا۔ خدا تجھے سلامت رکھے۔"

میں نے سلام کیا اور دروازے کا بوریا اٹھا کر باہر گلی میں آگیا۔

لاریوں کے اڈے پر پہنچا تو لاہور جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ میں سوار ہو گیا اور

واپس لاہور کی طرف چل پڑا۔ لاہور آکر میں نے پرسی کو پوری روئیداد سنائی۔ پرسی خوش ہوا کہ بالی کو اس کے ماں باپ نے پھر سے قبول کر لیا۔

"یار لڑکیوں کی زندگی بڑی نازک ہوتی ہے۔ ذرا ٹھوکر لگی اور ساری زندگی برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ عورتوں کو بے عزت کرنے والوں کے لئے ملک میں بڑے سخت قوانین بننے چاہئیں۔ میں کہتا ہوں ایسے مردوں کو سرعام تختہ پر چڑھا دینا چاہیئے۔"

اگلے روز میں اپنی نوکری پر حاضر ہو گیا۔

زندگی پھر اسی پرانے ڈھرے پر چل نکلی۔ صبح سے شام تک سینما کے مینیجر کی خدمت گزاری اور رات کو کٹڑی کی کوٹھڑی میں آکر پڑ رہنا۔ ایک روز شام کو کٹڑی میں آیا تو وہاں ایک ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ساری کٹڑی کے لوگ فدن کی کوٹھڑی کے سامنے جمع تھے اور ایک منحنی سا منحوس صورت آدمی اچھل اچھل کر شور مچا رہا تھا۔ اس نے فدن کے سائیکل رکشا کو بھی باہر کھینچنے کی کوشش کی لیکن فدن نے اسے دھکا دے کر پرے گرا دیا۔ اُس آدمی نے چیخ چیخ کر کٹڑی سر پر اٹھالی۔ معلوم ہوا کہ فدن نے اس آدمی سے سود پر جو روپیہ لے کر اپنے بیٹے کی پیدائش پر جو قوالی کروائی تھی وہ ابھی تک ادا نہیں کیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ماہ بہ ماہ سود بھی ادا نہیں کیا۔

"میں نالش کر کے ڈگری لے لوں گا۔ کیا سمجھ رکھا ہے تو نے۔ میں تیری قُرقی کرا دوں گا۔ ارے واہ! باپ کا مال سمجھ کر ہضم کئے بیٹھا ہے؟ میں تو تیری سات پشتوں سے رقم وصول کر لوں گا۔"

دّلا ڈرائیور ساہو کار کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میاں صیب کچھ دن اوپر نیچے ہو گئے ہیں تو فکر نہ کریں۔ فدن ایسا آدمی نہیں۔ وہ آپ کی پائی پائی ادا کر دے گا۔"

ساہو کار نے پاؤں پٹک کر کہا:۔

"اصل زر تو رہا ایک طرف اس نے سود کی بھی ایک پائی ادا نہیں کی۔"

ابراہیم درکشا پی ٹیڑھی ناک پر انگلی پھیر کر بولا۔

"بڑے میاں تم سود لیتے ہی کیوں ہو؟ اس جز کو نکال کر باہر کیوں نہیں کرتے"

ساہوکار نے بھوئیں سیکڑ کر کہا:۔

"سود نہ لیں تو بال بچوں کا پیٹ کیسے پالیں؟"

اب کبڑے مولوی کے دخل دینے کی باری تھی۔

"سود اسلام میں حرام ہے۔ سود کھانے والے کا جنازہ جائز نہیں"

ساہوکار غصے میں ہاتھ ہلا کر بولا:۔

"آپ بے شک میرا جنازہ نہ پڑھائیں مولوی صاحب لیکن میں سود کی کوڑی کوڑی وصول کروں گا۔ آپ کو میری قبر میں آکر عذاب بانٹنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

فدن گھبرایا ہوا تھا۔ رنگ زرد ہو رہا تھا اور اپنی بے عزتی کے احساس کے باعث کسی سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ کیونکہ اس نے قوالی کی رات کٹڑی میں سب کو یہی کہا تھا کہ وہ اپنی جمع شدہ رقم سے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور کسی سے قرض لے کر یہ محفل رنگ و نغمہ نہیں سجا رہا۔ وہ کبھی کوٹھڑی کے اندر جا رہا تھا اور کبھی باہر آرہا تھا۔ کبھی اسے غصہ آجاتا اور وہ آپے سے باہر ہو کر آنگن سے لکڑی کا کندا اٹھا کر ساہوکار کا سر توڑنے باہر لپکتا تو عورتیں چیختی ہوئی اس سے لپٹ جاتیں اور فدن کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا۔ آخر کٹڑی والوں نے مل جل کر معاملہ رفع دفع کرادیا اور ساہوکار سے ایک مہینے کی مہلت لے لی۔

ساہوکار نے دانت کٹکٹا کر کہا:۔

"اب کے بھی روپیہ ادا نہ کیا تو سارے برتن بھانڈے بکوادوں گا"

ایک دن اد کاڑے سے بالی کا خط آیا۔

میں منیجر کے دفتر کے باہر سٹول پر بیٹھا تھا کہ کلرک نے خط لا کر میری جھولی میں پھینک دیا۔ میں نے سمجھا کہ کلرک سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس نے کسی دوسرے کا خط مجھے دے دیا ہے کیونکہ مجھے زندگی بھر کسی نے خط نہیں لکھا تھا۔ لیکن لفافے پر میرا نام لکھا تھا اور پتہ بھی سینما کا تھا۔ میں نے لفافہ پھاڑ کر خط باہر نکالا۔ "میرے پیارے" اس کے آگے میرا نام تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے جھٹ کاغذ کے نیچے دیکھا۔ وہاں بالی لکھا تھا۔ بالی خود تو ان پڑھ تھی۔ اس نے یہ خط اپنی ایک سہیلی سے لکھوایا تھا اور پتہ بھی اسی کا دیا تھا۔ اس خط میں بالی نے صاف صاف لکھا تھا کہ وہ میری یاد میں بے قرار ہے اور چاہتی ہے کہ میں اوکاڑہ جا کر اسے مل آؤں۔ بڑے سیدھے سادے انداز میں اس نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ میں نے خط کو کئی بار پڑھا اور اگر منیجر گھنٹی نہ بجاتا تو میں ابھی اسے پڑھتا ہی چلا جاتا۔ جب میں اندر گیا تو معلوم ہوا وہ کتنی دیر سے گھنٹی بجا رہا تھا۔

اس نے ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر کہا:۔

"باہر کیا جھک مار رہے تھے تم؟"

بالی کا خط میں نے پرسی کو بھی پڑھایا۔ وہ کہنے لگا:۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے پیار کرنے لگی ہے۔"

میں نے دل میں فخر محسوس کرتے ہوئے کہا:۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

پرسی نے سگریٹ پھینک کر پوچھا:

"اور تم بھی اس سے پیار کرتے ہو کیا؟"

مَیں نے اصل بات کو چھپا کر کہا:۔

"پیار تو نہیں کرتا۔ البتہ مجھے اس سے ہمدردی ضرور ہے۔"

پرسی نے مسکرا کر کہا:۔

"عورت سے ہمدردی پیار کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ بالی مجھے بھی بہت یاد آئی تھی۔ اس کا سانولا سانولا دبلا پتلا جسم، بڑی بڑی کاجل لگی آنکھیں اور نظریں جھکا کر شرمیلا بات کرنے کا انداز میرے دل پر پہلے ہی روز وار کر گیا تھا اور پھر ہماری کوٹھڑی میں جب وہ صبح اٹھ کر بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی تو اس کے باریک ریشمی بال کتنے لمبے تھے۔ وہ اس کی پیٹھ پر مور کے جھاڑ کی طرح لہرا رہے تھے لیکن میں نے اپنے دل کی حالت کسی پر ظاہر نہیں کی تھی۔ میں نے اس کا ذکر بالی سے بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں اس خیال میں تھا کہ جو عورت ایک بار کسی سے محبت کر کے زبردست ٹھوکر کھا چکی ہو وہ دوبارہ اس خارزار میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔

مگر بالی کے محبت بھرے خط نے میرے حوصلے بلند کر دیئے اور میرے سامنے عشق و محبت کے دروازے کھول دیئے۔ ہر دروازے کی دوسری جانب گلاب کے کھلے ہوئے پھول خوشبو اڑا رہے تھے اور ساون کی گھنگھور گھٹائیں برس رہی تھیں۔ میں نے دوسرے دن شام کو تلندر ہوٹل سے چائے پی اور لارنس باغ میں جا کر بالی کو محبت بھرا خط لکھ ڈالا۔ رات کو میں نے یہ خط بڑی احتیاط سے سنبھال کر اپنے ٹرنک میں رکھا اور صبح بڑے ڈاک گھر میں جا کر ڈبے میں ڈال دیا۔ چوتھے روز بالی کا جواب آ گیا۔ اس نے خط پنجابی کے ایک بیت سے شروع کیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "میں نے سنا ہے جن کی دوستی کچی ٹوٹ جاتی ہے وہ کنواریاں دریا کے پتنوں پر جا کر رو دیا کرتی ہیں۔ میرے ماہی!

گیا، مجھے بھی تو ایک دن ایسا نہیں کرنا پڑے گا؟" خط اگرچہ غلط سلط اردو میں لکھا تھا لیکن دل کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سچا اور محبت کے شہد میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ خط میں نے پرسی کو نہ دکھایا۔ اسے اپنے ساتھ جیب میں لئے لئے پھرا۔ سینما میں ذرا فرصت ملتی تو اسے کھول کر پڑھنے لگتا۔ خط کی تحریر ہر بار نئی محسوس ہوتی اور ہر بار اسے پڑھنے سے ایک نیا مزا ملتا۔ یہ خط مجھے زبانی یاد ہو گیا۔ بالی نے ایک بار پھر تاکید لکھی تھی کہ میں اوکاڑے آکر اسے ضرور مل جاؤں وہ میری صورت دیکھنے کو ترس گئی ہے۔ اس نے مجھ سے میری ایک تصویر بھی مانگی تھی۔ میرے پاس اپنی کوئی تصویر نہ تھی۔ کبھی تصویر کھنچواتے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ میں نے میو ہسپتال کے باہر جا کر فوراً ایک تصویر کھنچوا ڈالی۔ لیکن پسند نہ آئی کیونکہ اس تصویر میں میری شکل مجھ سے کم اور فوٹو گرافر سے زیادہ ملتی تھی۔ میں نے اسے پھاڑ ڈالا اور پرسی کے ساتھ میکلوڈ روڈ سے ایک نئی تصویر کھنچوائی یہاں فوٹو گرافر نے مجھے سر پر اوڑھنے کے لئے ایک انگریزی ہیٹ اور گلے میں باندھنے کے لئے ایک نکٹائی دی۔ یہ تصویر بڑی رعب والی تھی میں پورا انگریز لگ رہا تھا۔ میں نے یہ تصویر بالی کو بھیج دی اور لکھ بھیجا کہ میں عنقریب اوکاڑے آرہا ہوں۔ بالی نے جواب میں بڑی خوشی کا اظہار کیا اور لکھا کہ وہ میری تصویر کو کئی بار چوم چکی ہے۔

"سچی تم کسی دفتر کے بابو لگ رہے ہو۔ تمہاری تصویر ہر وقت میری انگیا میں رہتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ اسے سوائے میرے اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میرے جانی! اب تم جلدی سے اوکاڑے آجاؤ اور میری ترستی ہوئی آنکھوں کی پیاس بجھاؤ......"

مجھے گویا اچانک کوئی خزانہ ہاتھ آگیا تھا۔

یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور اس نے میرے جسم و جاں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اب میں ہر وقت بنا سنورا رہتا۔ اپنے بالوں میں تیل لگا کر کنگھی سے ان کے چھلے بناتا۔ میں نے ملیشئے کی دو پتلونیں اور بنوا لیں۔ لنڈے میں جا کر ایک گرم کوٹ بھی خرید لیا۔ ہر روز داڑھی بنانے لگا۔ دیر تک ٹوٹے ہوئے آئینے کو کھاٹ پر سلستہنے...

رکھ کر قینچی سے مونچھوں کے بال کُترا کرتا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے پڑھائی بھی شروع کر دی تھی۔ دفتر میں فرصت کے وقت ٹکٹ کلرک سے سبق لیا کرتا اور رات کو بلب جلا کر انگریزی کی الف ب یاد کیا کرتا۔ موسم سرما شروع ہو چکا تھا کہ میں نے دفتر سے دو روز کی چھٹی لی اور بالی سے ملنے اس کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے اپنی آمد کی اطلاع بالی کو نہیں دی تھی۔ میں اس کو اچانک ہی ملنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کی خوشی میں حیرت کا بھی اضافہ ہو جائے۔ جس وقت میں بالی کی گلی میں پہنچا تو میرا دل میرے سینے میں مسرت سے اچھل رہا تھا۔ اب یہ گلی اُس گلی سے بالکل مختلف تھا جہاں میں اس روز بالی کے ساتھ داخل ہوا تھا۔

اس روز تو میں ایک ایسے آدمی کی طرح گلی میں سے گزر رہا تھا جو عدالت میں فیصلہ سننے جا رہا ہو۔ لیکن آج میں عاشق کے روپ میں محبوبہ کا دیدار کرنے جا رہا تھا۔ مکان کا دروازہ بالکل ویسے ہی تھا۔ بوریا لٹک رہا تھا اور اس کے پیچھے کیواڑ بند تھے۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ ابھی دروازہ کھلے گا اور بالی مجھے دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔ کسی نے آہستہ سے کیواڑ کھولا اور بوریا ذرا سا اٹھا کر مجھے دیکھا۔

یہ بالی کی ادھیڑ عمر ماں تھی۔ پہلے تو وہ مجھے پہچان ہی نہ سکی۔ کیونکہ میں خوب بوٹ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جب میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے بڑے پیار سے اندر بلا لیا اور میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر میرا ماتھا چوما۔

"جی آیاں نوں پترا — میں تو پہچان ہی نہ سکی۔ بوڑھی ہو گئی ہوں بیٹا۔ نظر جواب دینے لگی ہے۔ تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ ناں۔"

میں کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ جس صورت کو دیکھنے میں آیا تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اب میں پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک کہاں ہے۔ بالی کی ماں نے چولہا جلا رکھا تھا اور روٹیاں پکا رہی تھی۔

" ابھی بالی بھی آ رہی ہو گی۔ وہ ذرا پڑوس میں کمیٹی کے پیسے دینے گئی ہے۔ بیٹے تم نے تو کبھی خیریت کا خط بھی نہ لکھا۔ میں بالی کو روز کہتی تھی کہ بیٹے کو خط لکھ کر خیریت،

معلوم کر دے کہنے لگی کہ میرے پاس تو اس کا پتہ ہی نہیں۔ اچھا میں نے کہا۔ دلوں میں پیار ہو گا تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔"

یہ سن کر میری جان میں جان آئی کہ بالی وہیں ہے اور ابھی آ رہی ہے۔ میں لاہور سے ماں جی کے لئے دو سیر مٹھائی ٹوکری میں بندھوا کر ساتھ لیتا آیا تھا۔ میں نے ٹوکری ماں جی کو دی تو اس نے کہا:۔

"بیٹا یہ تم نے کیا تکلیف کی۔ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا:۔

"ماں جی یہ میری خوشی کے لئے رکھ لیں"

دروازے کا بوریا ہٹا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ ماں جی نے کہا:۔

"آ گئے ہو رحمتی! میں نے روٹی باندھ رکھی ہے"

معلوم ہوا کہ یہ لڑکا بالی کے باپ کے پاس دکان پر کام کرتا ہے اور اس کی روٹی لینے آیا ہے۔ لڑکے نے مجھ پر ایک اجنبی سی نظر ڈالی اور پھر رومال میں بندھی ہوئی روٹی اٹھا کر سلام کر کے باہر نکل گیا۔ ماں جی نے کہا:۔

"بیٹا اب تم بھی روٹی کھا لو"

"مجھے ابھی بھوک نہیں لگی ہے ماں جی"

"کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔ اتنی دور سے آئے ہو اور بھوک نہیں"

"اچھا تو کچھ دیر بعد کھا لوں گا"

میں نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر سگریٹ جلایا اور اس کے کش لیتے ہوئے بالی کی ماں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے بے چینی کے عالم میں بالی کا انتظار کرنے لگا۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا، بوریا ہٹا اور میرے خوابوں کا چاند یعنی بالی نمودار ہوئی۔

"ماں جی! گاماں کی ماں کہتی ہے......"

بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی۔ وہ مجھے حیرت سے تکنے لگی۔ اس کا سانولا سا مکھڑا مسرت سے کھل اٹھا۔ سرخ نگینے والی کیل اس کی چھوٹی سی ناک میں جھلملا رہی تھی وہ نسواری برقعے میں تھی اور پھولدار قمیض کے اوپر سبز سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ ماں جی نے مسکرا کر کہا:۔

"بیٹی جانی لاہور سے آیا ہے۔ کیا کہتی تھی گاماں کی ماں؟"

بالی جلدی سے اپنے حواس میں آگئی۔ وہ شرمائی ہوئی سی میرے قریب سے گزری برقعہ اتار کر الگنی پر لٹکایا اور بولی:۔

"ماں کہتی تھی کہ پچھلی کمیٹی کا انگوٹھا کاپی پر نہیں لگایا۔"

"اری تو کاپی لے آئی ہوتی۔ ان لوگوں کا کیا ہے یہ تو فوراً مکر جائیں گے۔"

"کہتی تھی میں پھر بھجوا دوں گی۔"

بالی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر پھر سنجیدہ ہوگئی۔ وہ بڑی خوش ہوگئی تھی اور جلدی جلدی کام کاج کر رہی تھی۔ چارپائی جلدی سے بچھا دی گئی برقعہ لپیٹ کر وہ کوٹھڑی میں رکھ آئی۔ ماں جی نے کہا:۔

"جانی بیٹا اب ہاتھ دھو کر روٹی کھالو۔ بالی ہاتھ دھلوا دو۔"

بالی لوٹا اور صابن لے کر کھُرے میں جا کھڑی ہوئی۔ میں جھک کر ہاتھ دھونے لگا۔ بالی پانی ڈال رہی تھی۔ بیچ بیچ میں ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا لیتے تھے ہاتھ دھو کر میں پھر کھاٹ پر آ بیٹھا۔ بالی نے چنگیر میں روٹی اور کٹورے میں سالن لاکر میرے آگے رکھ دیا۔ جب وہ پانی کا گلاس میرے پاس رکھنے کے لئے ذرا جھکی تو میں نے ماں جی کی آنکھ بچا کر اس کے چٹکی بھر لی۔ بالی ذرا کسمسائی اور دوسری طرف منہ کر کے مسکرانے لگی۔ اس نے ماں جی سے پوچھا:۔

"میاں جی کو روٹی بھجوا دی ماں؟"

"ہاں بیٹی رحمتی آکر لے گیا تھا۔ تم بھی بیٹھ کر کھالو۔"

"نہیں ماں جی مجھے بھوک نہیں ابھی۔"

بھوک مجھے بھی نہیں تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم دونوں کی بھوک جاتی رہی تھی بالی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ مسرت کا اظہار اس کے انگ انگ سے ہو رہا تھا۔ وہ تتلی کی طرح اس بوسیدہ گھر کے نیم تاریک آنگن میں اڑتی پھر رہی تھی۔ روٹی کھانے کے بعد میں بالی کے والد سے ملنے دکان پر چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ فوراً ایک دکان سے چائے کا بالائی ڈالا کپ منگوایا۔ اس نے بھی مجھ سے گلہ کیا کہ میں نے لاہور جا کر پھر کوئی خط ہی نہیں لکھا۔ بالی کے ماں باپ کی طرف سے اس گرمجوشی کو دیکھ کر میں بے حد خوش ہوا۔ اب میں بڑی بے فکری سے یہاں آکر بالی سے ملاقات کر سکتا تھا۔ ہماری محبت کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ دکان سے اٹھ کر چلنے لگا تو میاں جی بولے :۔

"کہاں چلے بیٹا؟"

میں نے کہا :۔

"یونہی ذرا شہر میں گھومنے جا رہا ہوں"

"جلدی گھر لوٹ آنا"

مجھے یوں لگا جیسے اپنے ہی گھر میں اپنے ہی لوگوں میں آگیا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے میرے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا۔ دو تین گھنٹے میں شہر میں یہاں وہاں گھومتا پھرتا رہا۔ ایک جگہ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا کپ پیا۔ دوسرے بازار سے گزرتے ہوئے پان کھایا۔ سگریٹ کی نئی ڈبیا خریدی۔ ایک سینما گھر میں جا کر نئی فلموں کی تصویریں دیکھیں۔ نہر کنارے بیٹھ کر ایک گنا چوسا۔ ایک آدمی سے کانوں کی میل نکلوائی۔ چائے کا ایک اور کپ پیا۔ پان کھایا اور سگریٹ سلگا کر گھر کی طرف چل پڑا۔

بالی نے نئی قمیض پہن کر بالوں میں کنگھی کر رکھی تھی اور سر پہ دوپٹے کر ٹکٹکی مارے بے قراری سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ جب میں اندر داخل ہوا تو اس نے میری طرف ایسی مضطرب نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔ اتنی دیر کہاں لگا دی؟ اس نے میرے لئے خاص طور پر کوٹھڑی میں پلنگ بچھا دیا تھا۔ اس پر نیا کھیس پڑا تھا اور صندوق میں سے

لٹکا ہوا تھا نکور پھولدار لحاف ایک طرف رکھا تھا۔ اس لحاف میں سے فنائل کی مہکی مہکی بو نکل کر کوٹھڑی کی فضا میں حل ہو رہی تھی۔ شام کو سب نے ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بالی نے سر درد کا بہانہ بنا کر ماں سے کہا کہ وہ میٹھی چائے پیئے گی۔ بالی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں چائے کا عادی ہوں۔ بالی کا باپ چائے کا گلاس ہاتھ میں لے کر لاہور کی باتیں پوچھتا رہا۔

"بڑا ایل نمبر شہر ہے اب تو آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ جوانی کے دنوں میں میں بھی لاہور کی سبزی منڈی میں کام کیا کرتا تھا۔ ان دنوں لاہور اتنا بڑا شہر نہیں تھا۔ بالی کی ماں ہم منڈی سے سبزی لاد کر باہر نکلتے اور تیر کی طرح چوک عبور کر جاتے تھے لیکن اب تو کہتے ہیں کہ اس چوک میں سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لاہور تو ولایت بن گیا ہے۔ یار ٹھنڈی سڑک پر دو منزلوں والی موٹریں چلتی ہیں"

لالٹین کی روشنی میں بالی کے لونگ کا نگینہ چمکارے مار رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے پاس میلی سی چادر اوڑھے بیٹھی پیڑھی پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ جب وہ ہونٹ پیالی سے لگاتی تو میری طرف بھی دیکھ لیتی۔ کچھ دیر یہ محفل چولہے کے پاس گرم رہی۔ جب بالی کے باپ کا حقہ بجھ گیا تو وہ جمائی لے کر بولا:۔

"جانی بیٹا! اب تم سو جاؤ۔ دن بھر کے تھکے ہوئے ہو"

اب اسے کون بتاتا کہ بالی کو دیکھ کر میری ساری تکان دور ہو گئی تھی اور میں اس رات بالی کے سامنے حشر کے روز تک بیٹھ سکتا تھا۔ بالی کی محبت بھری نگاہیں میرے دل کے پھول پر تازگی اور شگفتگی کی شبنم گرا رہی تھی۔ میں تازہ دم اور مسرور تھا۔ مگر مجبوراً وہاں سے اٹھنا پڑا۔ میں اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ بالی کی ماں نے لالٹین میری کوٹھڑی میں لٹکا کر کہا:۔

"بیٹے کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دینا۔ پانی کا گلاس طاق میں رکھ دیا ہے"

"شکریہ ماں جی۔ اب آپ آرام کریں"

ماں جی چلی گئیں۔ میں نے پتلون قمیض اتار کر دھوتی باندھی۔ لالٹین کی بتی نیچی کی اور لحاف گھس گیا۔ نئے لحاف کی چھینٹ کھڑکھڑا رہی تھی اور داڑھی کے بالوں کے ساتھ چپک جاتی

تھی ۔ میری ایسی خاطر و مدارت پہلے کہیں نہ ہوئی تھی ۔ میں تو اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھنے لگا تھا۔ کوٹھڑی والے میرے اپنے لحاف کی روئی جگہ جگہ اکٹھی ہو کر جڑ گئی تھی اور اس کا ابرہ تو میل سے کالا پڑ گیا تھا۔ یہ لحاف بڑا گرم تھا۔ میں کچھ دیر تو اپنی محبوبہ بالی کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر جانے کس وقت مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔

اچانک کسی نے آہستہ سے میرا کندھا ہلایا۔ میں جاگ پڑا۔ بالی نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی ہتھیلی میں سے ہلدی کی ہلکی ہلکی بو آ رہی تھی۔ میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔

" بیٹھ جاؤ "

" خدا کے لئے آہستہ بولو "

بالی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا اور چپکے سے میرے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اس کی آنکھیں لالٹین کے نیم اُجالے میں چمک رہی تھیں اور کسی وقت ناک والا لونگ چمکارا دے جاتا۔ اس نے جلدی سے اُٹھ کر لالٹین بجھا دی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ اب اندھیرے میں مجھے اس کے جسم کا ایک خاکہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کان باہر کی ہر آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔

" میں بڑی ڈر ڈر کر یہاں آئی ہوں "

" میں بھی تمہارا انتظار کر رہا تھا "

" جھوٹ — تم تو سو رہے تھے "

" نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے بالی ۔ میں راہ دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا "

ہم ایک دوسرے کے بالکل قریب بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کے سانس لینے کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں اپنا ہاتھ بالی کے ہاتھ میں دے کر کہا:۔

" مجھے تمہارے سارے خط مل گئے تھے۔ تمہیں بھی میرے خط مل گئے تھے ناں "

بالی نے بڑی مدھم آواز میں کہا:۔

"ہاں"

میں نے کہا:۔

"بالی! تم نے پہلے خط میں میرے ہی دل کی روئیداد قلم بند کی تھی۔ یہاں سے جاکر میں تمہاری یاد میں بے قرار تھا۔ دن رات تمہیں ہی یاد کیا کرتا۔ مگر تمہیں خط نہیں لکھ سکتا تھا۔ ملتے ہوئے ڈرتا تھا کہیں تمہارے گھر والوں کو شک نہ پڑ جائے۔ تمہیں سچ کہہ رہا ہوں بالی! تمہارے عشق نے تو مجھے دنیا کی ساری باتوں سے بیگانہ بنا دیا ہے۔ تمہیں میری تصویر پسند آئی تھی کیا؟"

بالی نے شرمیلی آواز میں کہا:۔

"ہاں — بڑی پیاری تھی۔ میں تو اسے ہر روز صبح اٹھ کر دیکھا کرتی ہوں۔"

میں نے شرارت سے پوچھا:۔

"تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

میں نے دیکھا کہ اندھیرے میں بالی نے اپنا سانولا سلونا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا۔

"میں جانتا ہوں بالی — لیکن جب تم نہاتے وقت انگیا اتارتی ہو تو تصویر کو کہاں رکھتی ہو؟"

بالی نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا:۔

"میں نے تمہاری تصویر اپنی سہیلی کے ہاں خطوں کے ساتھ ہی رکھوا دی ہے۔ یہاں مجھے بڑا دھڑکا لگا رہتا تھا۔"

میں نے بالی کا ہاتھ چوم کر پوچھا:۔

"بالی! کیا تم سچ مچ مجھ سے محبت کرتی ہو؟ بولو!"

اس نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبا لیا اور دل پر رکھ کر بولی:۔

"اگر محبت نہ ہوتی تو تمہیں خط کیوں لکھتی؟ تم سے تمہاری تصویر کیوں منگوائی؟ تمہیں بار بار اپنے شہر میں آنے کا کیوں کہتی؟ کیا اب بھی تمہیں اعتبار نہیں آ رہا؟"

میں نے کہا:۔

"یہ بات نہیں ہے بالی - مجھے تمہاری محبت کا یقین ہے - اگر شک ہے
تو صرف اس بات کا کہیں تم مجھے بھی بھلا نہ دو۔"
بالی خاموش ہوگئی - پھر میری طرف چہرہ اٹھا کر بولی -
"میں نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی - میں دوسروں کی باتوں میں آ
گئی تھی - میں راستے سے بھٹک گئی تھی - مجھے اس دھوکے باز نے ورغلا کر
اپنے ساتھ لگا لیا تھا - اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو میں پھر اسے چھوڑ کر
اپنے گھر کبھی نہ آتی - بلکہ اس کے ساتھ ہی رہتی چاہے وہ میرے ٹکڑے ٹکڑے
کر کے چیل کوؤں کو ڈال دیتا۔"
میں نے سگریٹ سلگانا چاہا تو بالی نے ہاتھ سے مجھے روک دیا ۔
"محبت میں نے صرف تم سے کی ہے - اور تم سے ہی کرتی رہوں گی -
تم میرا گلا بھی گھونٹ ڈالو گے تو کچھ نہ کہوں گی - میں تمہیں گیارویں والے سچے
پیر کی قسم کھا کر کہتی ہوں - اب بھی تمہیں یقین نہیں آیا۔"
میں نے بالی کو اپنے سینے سے لگا لیا - اس نے اپنا سر میری چھاتی پر رکھ دیا اور
لمبے لمبے سانس لینے لگی . میں نے پوچھا :-
"تم جس سہیلی سے خط لکھواتی ہو وہ تمہارے بھروسے کی عورت ہے ناں؟
کہیں وہ تمہارا راز تو فاش نہیں کر دے گی؟"
بالی نے مسکرا کر کہا : .
"نہیں وہ ایسی نہیں ہے - وہ تو میرے دکھ درد کی ساجھی ہے - اسے مجھ
سے بہت ہمدردی ہے - اس شہر میں وہی تو ایک میری سہیلی ہے۔"
پھر بولی :-
"تم کل لاہور مت جانا - ایک دو روز ذرا اور ٹھہر جاؤ۔"
میں نے بالی کی آنکھوں پر بوسہ دے کر کہا :-
"نوکری کا معاملہ ہے بالو! مجبوراً کل جانا ہی پڑے گا - ہاں اتنا کر سکتا ہوں

کہ صبح کی بجائے شام کو آخری بس پر نکل جاؤں گا۔"

"پھر کب آؤ گے؟"

"جب تم بلاؤ گی۔"

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے یہیں رہ جاؤ۔ ہر وقت میرے سامنے رہو اور میری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو۔"

میں نے کہا:۔

"کیا ایسا وقت بھی آ سکتا ہے بالی؟"

بالی چپ ہو گئی۔ میں نے اسے کھینچ کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ میرے اندر آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں چاروں طرف آگ لگے جنگل کے وسط میں کھڑا ہوں۔ بالی کا نرم و نازک گرم جسم میرے مضبوط جسم کے گرد بیل کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ وہ اس طرح گرم جوشی سے مجھے پیار کر رہی تھی جیسے آخری بار میرے گلے مل رہی ہو۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھلا لیا اور اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میری سانس چڑھ گئی تھی اور میں سانڈ کی طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح کبھی اس کا منہ چومتا۔ کبھی گردن کبھی رخسار، کبھی سینے اور کبھی بازو پر بوسے دیتا۔ بالی کی بھی قریب قریب یہی حالت تھی۔ پھر بھی اس نے زیادہ ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور گہرا سانس لے کر بولی:۔

"ابھی وقت نہیں آیا جانی۔ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔"

"جب دو پیار کرنے والے گلے ملتے ہیں تو وقت آ جاتا ہے بالو! میرا ہاتھ نہ روکو۔"

بالی جلدی سے الگ ہو گئی۔

"ہائے کوئی آ رہا ہے۔"

میں بھی ایک دم چوکنا ہو گیا۔ لیکن باہر سوائے گہرے سناٹے کے اور کچھ نہ تھا۔ اصل میں یہ بالی نے چال چلی تھی۔ وہ مسکرائی اور میرا منہ چوم کر جلدی سے باہر چلی گئی۔ یہ سب کچھ اس نے اتنی تیزی سے کیا کہ میں اپنی مرضی کے مطابق اس کا پیار بھی نہ لے سکا۔ کوٹھڑی میں

پھر وہی سرد اور اندھیرا ایک خاموشی چھا گئی۔ اب یہ خاموشی زیادہ بوجھل محسوس ہونے لگی کیونکہ اس کی دبیز تہوں میں دو پیار کرنے والوں کی پراسرار سرگوشیاں اور محبت بھرے ادھورے بول سو رہے تھے۔ فضا میں بالی کے نازک پھول ایسے بدن کی نمکین سی سگندھ رچی ہوئی تھی۔ میں نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا اور بالی کے متعلق اپنی محبت اور اس کے انجام کے متعلق سوچتا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ بالی مجھے بیوقوف تو نہیں بنا رہی۔ پھر میری نگاہوں میں وہ خوفناک منظر گھوم کر آ گیا جب میں سینما کے دوسری منزل والے کمرے کے سوراخ میں سے اس عورت کے لم تڑنگ بلیے اپریٹر کے کندھوں پہ بالکل عریاں حالت میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دلدوز تصویر بھی میری آنکھوں میں پھرنے لگی جب اسی کمرے میں اسی پلنگ پر یہ عورت گلوگیٹ کیپر کے ساتھ بالکل ننگی گتھم گتھا ہو رہی تھی۔ میرا حلق انتہائی کڑوا ہو گیا۔ دماغ بھنّانے لگا۔ میں نے دانت بھینچ لئے اور اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ میں ماضی کی ان زہر بھری نشانیوں کو اپنے ذہن میں سے نکال دینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ آستین کے سانپ، پھنکارتے ہوئے اپنی سُرخ زبانیں ہلاتے میرے سامنے آ کھڑے ہوتے تھے پھر میں نے اپنے دل کو یوں تسلی دی کہ شریف سے شریف عورت بھی اگر بدکاروں کے چنگل میں پھنس جائے تو اس کا بھی یہی حشر ہو گا۔ بالی نیک دل لڑکی ہے۔ اگر وہ آوارہ ہوتی تو کبھی مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر کو واپس نہ جاتی۔ اس کے بعد میرے ذہن کی اذیت کچھ کم ہوئی اور میں سو گیا۔ صبح اُٹھ کر بالی کا شگفتہ نکھرا ہوا دھلا دھلایا مسکراتا چہرہ دیکھا تو رات کے سارے ڈراونے خیالات رفو چکر ہو گئے۔

اسی شام میں لاہور واپس آ گیا۔ دو تین روز بالی کی یاد میں اداس رہا۔ اس کے گرم جسم کا لمس اور ہتھیلی میں سے اُٹھتی ہلدی کی بو ہر وقت میرے گرد ہالہ سا بنائے رکھتی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو اندھیرے میں اپنی طرف ٹکٹکی باندھے تکتے دیکھتا۔ اپنے جسم پہ اس کے ریشمی نرم نرم گداز بدن کا لطیف دباؤ محسوس کرتا۔ اپنے سینے پہ بالی کے گرم سانس کی لپک محسوس ہوتی۔ اس کا بار بار شرمیلی نگاہوں سے دیکھنا یاد آتا۔ اس کی وہ تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی۔ جب وہ اچانک اپنے گھر میں مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی تھی اور بات کرنا بھول

گئی تھی۔ تین چار روز تک میں غمگین اور چڑچڑا سا بنا رہا۔ نوکری زہر لگنے لگی۔ کسی سے بھی کوئی بات نہ کی۔ دل سے بس یہی ایک صدا اٹھتی کہ بوریا بستر باندھ کر اسی دلدار کی گلی میں چلو اور وہیں کے ہو رہو۔ اوکاڑہ لاہور کے مقابلے میں پیرس معلوم ہونے لگا۔ اخبار میں اوکاڑہ کی کوئی خبر چھپی ہوئی دیکھ لیتا تو اسے بار بار پڑھتا۔ کوئی بس اس طرف کو جا رہی ہوتی تو اس کے مسافروں کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتا رہ جاتا۔

پورا ایک ہفتہ اسی خود فراموشی کے عالم میں گزر گیا۔ پھر جا کر کہیں طبیعت سنبھلی اور لاہور شہر کی جانی پہچانی صورتیں سامنے آنے لگیں۔ بالی کا خط ہر تیسرے روز آجاتا۔ جس کا جواب میں اسی روز لکھتا اور اگلے دن ڈاک میں ڈال دیتا۔ زندگی کی گاڑی پھر اسی لگی بندھی رفتار کے ساتھ کھڑ کھڑ کسی نامعلوم منزل کی طرف چل پڑی۔ اب صرف اتنا فرق ضرور پڑ گیا تھا کہ پتھروں، شہتیروں اور کوڑا کرکٹ سے بھرے ہوئے ڈبوں کے ساتھ ایک ڈبہ ایسا بھی آن لگا تھا جس میں زندگی کے سہانے خواب بھرے ہوئے تھے اور جس کی آہنی دیوار سے لگی دو کالی آنکھیں مجھے محبت سے تک رہی تھیں۔ ان نشیلی آنکھوں نے مجھے ایکٹروں کے عجیب الخلقت باسیوں اور سنیما والوں کی پُرملال دنیا سے بے تعلق کر کے اپنے ہی آپ میں گم کر رکھا تھا۔ ان کے وجود اور کارگزاریوں سے میں صرف ایک حد تک ہی باخبر تھا۔ جس طرح دھوپ میں چلتے ہوئے آدمی کو اپنے سائے کا موہوم سا احساس رہتا ہے۔ اب زندگی کا مفہوم میرے لئے زیادہ خوب صورت اور خوش آئند تھا۔ مجھے دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی اور حقیر سے حقیر شے میں بھی افادیت اور دلچسپی کا پہلو دکھائی دینے لگا تھا۔ میری محبت ایک مرکز پہ جمع ہو کر ساری دنیا میں پھیل گئی تھی۔ جس طرح سورج کی ساری روشنی ایک نقطے پر مرتکز ہو کر اپنی لازوال کرنیں چاروں طرف پھیلا دیتی ہے۔ اب کسی غیر عورت کو بری نظر سے دیکھنا میرے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ میں جس عورت کو دیکھتا مجھے فوراً بالی کا خیال آجاتا اور ساتھ ہی ساتھ یہ عجیب سا احساس بھی ہوتا کہ شاید یہ بھی کسی کی بالی ہو۔ شاید اس کا بھی کوئی نہ کوئی جانی۔ کوئی نہ کوئی محبت کرنے والا موجود ہو۔ جس طرح بالی کو کوئی مجھ سے نہیں ورغلا سکتا۔ اسی طرح اس عورت کو بھی کوئی اپنے محبوب سے منحرف نہیں کر

سکتا۔ میں ہر عورت کا احترام کرنے لگا تھا۔ سینما میں آئی ہوئی کوئی لڑکی مجھ سے کچھ دریافت کرتی تو میں اپنے علم کے مطابق بڑی شائستگی سے اسے جواب دیتا۔ اب میں نے منیجر کی غیر شرعی گاہ میں سوراخ سے جھانکنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس کام سے شرم سی محسوس ہونے لگی تھی۔ یونہی خیال آتا جیسے بالی میرے سامنے کھڑی ہے اور مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہے۔ جانی! تم یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ بری بات ہے۔ یا پھر اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ہر بار منیجر کی نشست گاہ والے پلنگ کو دیکھ کر اس منظر کا تصور آ جاتا جس میں میری محبوبہ ایک غیر مرد کے ساتھ گتھم گتھا ہو رہی تھی۔ میں نے نماز بھی پڑھنی شروع کر دی تھی اور انگریزی کا پہلا قاعدہ ختم کر لیا تھا۔ بکنگ کلرک نے مجھے دوسرا قاعدہ پڑھانا شروع کر رکھا تھا۔ جس میں انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جملے یاد کرنے پڑتے تھے۔ اے بی سی تو مجھے زبانی یاد ہو گئی تھی غرض کہ بالی کے عشق نے میری کایا ہی پلٹ دی تھی اور میں اپنے دل و دماغ میں ایک نئی قوت اور نئی روشنی کی کرنیں پھوٹتی محسوس کر رہا تھا۔

بالی سے میرے معاشقے کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔ پرسی سے دو بار میں نے کبھی بالی کے بارے میں بات نہیں کی تھی اور اس نے بھی پھر مجھ سے کبھی بالی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ گلوگیٹ کیبر اور اپر بازار بلا اسے بھول گئے تھے۔ اور نئی نئی عورتوں کے جتن میں مصروف تھے۔ میں بالی کے خط ڈیوٹی پر ساتھ نہیں لاتا تھا۔ بلکہ کوٹھڑی میں ہی ٹرنک میں بند کر کے رکھ دیتا۔ سینما کے دفتر میں ہفتے میں ایک بار میرا خط آتا تو مجھے بحفاظت مل جاتا۔ کیونکہ کسی کو شبہ تک نہیں تھا کہ کوئی لڑکی ایک معمولی چپڑاسی کو بھی محبت بھرا خط لکھ سکتی ہے میں نے ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا کر تھوڑی بہت رقم بھی جمع کر لی تھی۔ کچھ کپڑے بھی بنوا لئے تھے۔ میں شام کو کام سے فارغ ہو کر کپڑے پہن کر پرسی کے ساتھ بازاروں کی سیر کو نکل جاتا اور ہم دونوں قلندر ہوٹل کی گندی چائے کی بجائے میکلوڈ روڈ کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر چائے کا ہاف سیٹ منگوا کر پیا کرتے۔

سردیاں ختم ہو گئی تھیں اور پھاگن کا خوشگوار مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ درختوں پہ نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں اور بہار کی بڑی پیاری ہوا چل رہی تھی کہ میں بالی سے ملنے اداس

گیا۔ بالی کو دیکھے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔ ادھر وہ بھی بے تاب تھی
وہ ہر خط میں مجھے بلایا کرتی تھی۔ لیکن میں ان کے گھر بار بار جانے سے اپنی قدر نہیں کھونا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس طرح میری قدر نہیں کھو جائے گی بلکہ بالی سے ملنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ بالی کے ماں باپ حسب سابق بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ اس دفعہ میں بالی کے ماں باپ کے لئے دسوتی کا ایک جوڑا۔ اس کی ماں کے لئے وائیل کی دو قمیضوں کا کپڑا اور بالی کے لئے ایک ریشمی قمیض کا ٹکڑا ساتھ لے گیا تھا۔ وہ لوگ ان تحفوں کو دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے اور میری پہلے سے زیادہ آؤ بھگت ہوئی۔ میں دو دن ان کے ہاں رہا بالی تو میرے آگے پیچھے بچھی جاتی تھی۔ دن کو تو موسم خوشگوار ہوتا۔ لیکن رات کو ٹھنڈ ہو جاتی۔ پہلی رات بالی میری کوٹھڑی میں نہ آسکی۔ کیونکہ اس کا باپ بار بار کھانس رہا تھا اور اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ لیکن دوسری رات وہ چپکے سے اٹھ کر میرے پاس آگئی ہم دونوں بے اختیار ہو کر گلے ملے۔ کچھ شکوے شکایتیں ہوئیں۔ گلے گزاریاں کی گئیں۔ ایک دوسرے پر خط کا جواب دیر سے دینے کا الزام لگایا گیا اور پھر عشق و محبت کے راز شروع ہو گئے۔ میں نے بالی سے پوچھا۔

"بالی میں تم سے ایک بات کرنے آیا ہوں"

بالی نے ذرا سا گھبرا کر پوچھا:۔

"خیر تو ہے؟"

میں نے اس کا منہ چوم لیا۔

"بالکل خیر کی بات ہے۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری محبت کا انجام کیا ہوگا۔ ہم کب تک اس طرح چھپ کر ایک دوسرے کو خط لکھتے رہیں گے اور چوری چوری ملاقاتیں کرتے رہیں گے"

بالی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولی:۔

"جب تک دم میں دم ہے۔ جب تک ہم دونوں زندہ ہیں"

میں نے کہا:۔

"نہیں بالی! میں زندگی بھر تیرا انتظار نہیں کر سکتا۔ میں اپنی جوانی کے دن تم سے دور رہ کر بسر نہیں کر سکتا۔ اس کا کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیئے"

"کیا ہو سکتا ہے"

"شادی — کیا ہماری شادی نہیں ہو سکتی"

بالی خاموش ہو گئی۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا اور دوپٹے کا کنارا اپنی انگلی کے گرد لپیٹنے لگی۔ میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا:-

"چپ کیوں ہو گئیں بالی! کیا ایسا ہونا ناممکن ہے؟ میں تم سے نکاح کر کے تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں شرعی طریقے سے بڑی عزت کے ساتھ گھر لانا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے ماں باپ میری گذارش قبول نہیں کریں گے؟"

بالی نے گہری آواز میں کہا:-

"تم بات کر کے دیکھ لو"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا میری بات مان لی جائے گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی"

"کیوں۔ تمہیں ان کے ارادے کا علم ہونا چاہیئے۔ کبھی گھر میں تمہاری شادی کا ذکر ہوا ہے"

بالی نے میری طرف دیکھ کر کہا:-

"کبھی نہیں۔ یہ لوگ میری شادی کی بات کرتے ہوئے گھبرا رہے ہیں، میں ایک بار بدنام ہو چکی ہوں ناں۔ ان کا خیال ہے شاید کوئی بھی ماں اپنے بیٹے کے لئے میرا رشتہ قبول کرے۔ کوئی نند مجھے اپنی بھاوج بنانے پر اور کوئی آدمی مجھے اپنی بیوی بنا لے پر تیار نہیں ہوگا"

میں نے جلدی سے کہا:-

"مگر میں تیار ہوں بالی! میں تم سے بیاہ کرنے کو اپنی سب سے بڑی خوش قسمتی خیال کرتا ہوں۔ دیکھو میری کوئی ماں نہیں۔ کوئی بہن بھائی نہیں۔ میں

اکیلا ہوں۔ نہیں کوئی ساس، کوئی نند، کوئی دیور تمہاری پہلی زندگی کا طعنہ نہ دے سکے گا۔ تم صرف میری ہو گی اور میرے پاس ہی رہو گی۔"

بالی نے میرے بالوں پر اپنا ہاتھ محبت سے پھیر کر کہا:۔

"کاش ایسا ہو جائے جانی! میں بھی تم سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکوں گی لیکن کیا میرے ماں باپ راضی ہو جائیں گے۔"

"وہ کیوں نہیں راضی ہوں گے۔ انہیں تو اس موقع کو غنیمت جاننا چاہیئے۔"

"یہ بات نہیں جانی —— ہمارے گھرانوں میں جب کوئی لڑکی بدنام ہو جائے تو پھر اس کا جلدی بیاہ نہیں کرتے۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں دنیا یہ نہ کہے کہ انہوں نے جانے کون سا گناہ چھپانے کی خاطر لڑکی جھٹ سے بیاہ دی۔ پھر تو اس لڑکی کے گناہگار ہونے کا سب کو یقین ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کی گھریلو زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے مزید ایک سال انتظار کرنا ہو گا۔"

"اگر تم چاہتے ہو تو بات کر کے دیکھ لو۔ شاید میرے ماں باپ مان جائیں کیونکہ وہ تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ ماں جی تو تمہاری بہت تعریف کرتی ہیں۔ اکثر کہا کرتی ہیں۔ میں نے تو ایسا نیک لڑکا آج تک نہیں دیکھا۔"

میں نے بالی کا ہاتھ چوم کر کہا:۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

بالی مسکرا دی اور ہاتھ کھینچ کر بولی:۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

اور اس کے ساتھ منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر کہا:۔

"ایک بات ہے۔ اور وہ یہ کہ میں ماں جی سے بات کیسے کروں؟"

بالی نے سوچ کر جواب دیا:۔

"تم کس طرح بات کرنا چاہتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کسی عورت کو پیغام دے کر یہاں بھجوایا جائے تو ٹھیک رہے گا۔ کیوں؟"

بالی نے کہا:۔

"طریقہ تو یہی ہوتا ہے۔ آگے جیسا تم مناسب سمجھو کر کے دیکھ لو۔"

"میں خود بات نہ کروں؟"

بالی کہنے لگی:۔

"نہیں میرے خیال میں ایسا کرنا درست نہیں ہوگا۔ شاید ماں جی کو یہ بات اچھی نہ لگے۔ ہو سکتا ہے انہیں یہ خیال آجائے کہ اُن کی بیٹی کی بدنامی کے باعث ایسا کیا جا رہا ہے۔ تم وہی کرو جس طرح ایک شریف لڑکی کے لئے ہمارے گھروں میں کیا جاتا ہے۔ کیا تم کسی عورت پر بھروسہ کر کے اسے بھجوا سکتے ہو؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیوں میری نظر میں ایسی کوئی عورت اس وقت نہ تھی۔ میرا کسی گھرانے میں آنا جانا بھی نہیں تھا۔ پھر میں کسے بھیج سکتا تھا۔ بہرحال میں نے بالی سے کہا کہ اس کا انتظام لاہور جا کر ہو جائے گا۔ کوئی نہ کوئی رازدار اور بھروسہ کی عورت اتنے بڑے شہر میں کہیں نہ کہیں سے مل جائے گی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں لاہور جا کر عورت کا بندوبست کر لوں گا۔ اور انشاءاللہ اسی ہفتے کسی نہ کسی کو تمہارے گھر شادی کا پیغام دے کر بھجوا دوں گا۔"

بالی نے شرما کر مجھے دیکھا اور بولی:۔

"تمہیں دو ایک باتیں اور بھی سمجھا دوں۔ تم ایسا کرنا۔ اس کے ہاتھ ماں جی کے لئے اور میاں جی کے لئے ایک ایک جوڑا اور بادام چھوہارے بھی ضرور بھجوا دینا۔ اس طرح شاید انکار نہ کر سکیں گے اور انہیں بات طے ہی کرنی پڑے گی۔"

میں نے بالی کو سینے سے لگا کر اس کا منہ چوم لیا۔

"تم بڑی سمجھدار ہو۔ جتنا میں بے وقوف ہوں اتنی ہی تم عقل مند ہو۔ مجھے

تم جیسی عورت کی ہی ضرورت تھی۔"
بالی نے آہ بھر کر کہا:۔

"جانی! میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ساری عمر تم سے محبت کرتی رہوں گی۔ میرا سچا پیر جانتا ہے۔ میں دن رات کا ایک پل بھی تمہاری یاد کے بغیر بسر نہیں کرتی۔ ہر گھڑی ہر پل تمہاری طرف ہی خیال لگا رہتا ہے۔"

کافی دیر بعد ہم ایک دوسرے سے پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ جب رات بہت گزر گئی تو بالی میرا منہ چوم کر میری کوٹھڑی سے بالکل باہر نکل گئی۔ اگلے روز میں لاہور واپس آ گیا۔ اب اس فکر میں پڑ گیا کہ کسے پیغام دے کر ادکارہ بھیجوں۔ میں نے مصلحت کی بنا پر پرسی کو ساری بات سنا دی اور اسے بتا دیا کہ میں بالی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ہم دونوں نے بیاہ کا فیصلہ کر لیا ہے۔

"اب تم بتاؤ کہ اس کے لئے کس عورت پر بھروسہ کیا جائے اور کسے لڑکی والوں کے ہاں بھیجا جائے۔"

پرسی پہلے تو اس بات پر حیران ہوا کہ میں نے چپکے ہی چپکے محبت کی ساری منزلیں عبور کر لیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر اسے خوشی ہوئی کہ میں ایک عورت کا سہارا بن رہا تھا جسے قبول کرنے پر کوئی مرد اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی تیار نہ تھا۔ اس نے بھی بہتیرا سوچا مگر کوئی عورت ذہن میں نہ آئی۔ نتھی کی ماں کے بارے میں سوچا۔ لیکن وہ زمانہ ساز اور حرافہ عورت تھی۔ اس نے تو ساری کٹڑی میں ڈھنڈورا پیٹ دینا تھا تو پھر کیا فدّن کی بیوی کو بھیجا جائے۔

"نہیں یار جانی! فدن کی بیوی بھی ایک کائیاں عورت ہے ہم نے کبھی اس سے بات بھی نہیں کی۔ کیا خبر وہ بھی ادکارہ روانہ ہونے سے پہلے ساری کٹڑی کو خبردار کر دے اور بات بنتے بنتے بگڑ جائے۔ سو دشمن ہوتے ہیں۔"

مَیں نے سر کھجلا کر کہا :۔

" تو پھر کسے بھیجا جائے ؟ "

اچانک میرے ذہن میں ایک عورت آ گئی - میں نے چٹکی بجا کر کہا :۔

" پرسی ! عورت مل گئی "

" کون سی بھلا ؟ "

" چچی خیراں "

خیراں نامی ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم رحم دل عورت بلے شاہ تندور والے کی بیوی تھی - میں اور پرسی اسی تندور پر روٹی کھانے جایا کرتے تھے - یہ عورت ہمارے ساتھ بڑی شفقت اور مہربانی سے پیش آتی تھی - اگر میں اکیلا کہیں چلا جاتا تو پرسی کا پوچھتی - پرسی کبھی اکیلا روٹی کھانے چلا جاتا تو میرے بارے میں ضرور پوچھا کرتی - ویسے بھی اس کا کٹڑی والوں سے کوئی واسطہ نہ تھا بڑی مرنجاں مرنج اور ہنس مکھ عورت تھی - میری تجویز پر پرسی ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا :۔

" بالکل سولہ آنے ٹھیک عورت ہے - اس سے بڑھ کر اعتماد والی عورت ہمیں اور کہیں نہیں مل سکتی "

" میرا خیال ہے آج ہی اس سے بات کی جائے "

" بالکل ٹھیک ہے "

رات کو ہم جب تندور پر کھانا کھانے گئے تو چاچی خیراں نے حسب عادت ہمارے سلام کا مسکرا کر جواب دیا اور دعائیں دینے لگی - روٹی کھانے کے بعد ہم باہر بچھے ہوئے بنچ پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں موزوں موقع تلاش کرتے رہے لیکن اس وقت تندور پر کافی لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے - پرسی بولا :۔

" یار ابھی وقت نہیں - میرا خیال ہے میکلوڈ روڈ پر جا کر چائے پی آئیں واپسی پر بات کریں گے "

" چلو "

ہم دونوں چائے پینے میکلوڈ روڈ کے ایک ہوٹل میں آ بیٹھے۔ یہاں میں سارا وقت پرسی سے بالی کی باتیں کرتا رہا۔ مَیں نے اسے ذرا ذرا بات بتا دی۔ راتوں کو اس کا چھپ چھپ کر کوٹھڑی میں آ جانا۔ میرے لئے پراٹھے بنانا۔ سر درد کا بہانہ کر کے چائے تیار کروانا۔ تصویر کو انگیا میں چھپا کر رکھنا۔ غرضیکہ میں نے پرسی سے کوئی بات نہ چھپائی۔ مجھے بالی کے تذکرے سے ایک طرح کا فخر اور سرور مل رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ساری رات پرسی سے بالی کی باتیں کرتا رہوں اور اسے پوری طرح یقین دلا دوں کہ اس شہر سے میلوں دور ایک معمولی سے مکان میں ایک سیاہ آنکھوں والی عورت رہتی ہے جو ہر گھڑی میرے نام کی مالا کا جاپ کر رہی ہے۔ جس کے لئے میں دلیپ کمار، دیوداس، اور شہزادہ سلیم سے کم نہیں۔ جو میری پارو تی اور انارکلی ہے۔ پرسی سگریٹ سلگائے بڑے شوق سے میری باتیں سنتا رہا۔ درمیان میں وہ کبھی کبھی مجھے ٹوک دیتا۔

"ذرا پہلے والی بات پھر دہرانا۔"

وہ بھی میری داستان کے مزے لے رہا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد جب ہم تندور پر واپس آئے تو چاچی خیراں اکیلی بیٹھی کٹورے میں سے پیسے نکال کر گن رہی تھی۔ ہم دونوں اس کے پاس جا بیٹھے۔ خیراں نے مسکرا کر دیکھا اور بولی :۔

"آج پھر جیب خالی ہے کیا؟"

پرسی کبھی کبھی مہینے کے آخری دنوں میں چاچی خیراں سے روپیہ دو روپے قرض لے لیا کرتا تھا اور وہ بڑی خوشی سے دے دیا کرتی تھی۔ پرسی نے کہا :۔

"نہیں چاچی ایسی بات نہیں۔"

خیراں نے ایک پیسے کو دوپٹے سے پلو سے رگڑتے ہوئے پوچھا :۔

"پھر کیا بات ہے؟"

پرسی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بڑی سنجیدگی اور متانت سے خیراں کے سامنے ساری بات کھول کر رکھ دی۔ اس نے خیراں کو صرف اتنا ہی بتایا کہ اس کا دوست ایک جگہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ لڑکی اوکاڑے میں رہتی ہے۔ شریف لوگ ہیں۔ جانی کا گھر بار

تو ہے نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کا پیغام لے کر لڑکی والوں کے گھر جاؤ۔

"چاچی! ہمیں تمہیں اپنی ماں سے کم نہیں سمجھتے۔ یہاں اکیلے پڑے ہیں۔ آج ہماری بھی کوئی ماں بہن ہوتی تو ہم تمہیں کبھی تکلیف نہ دیتے۔"

خیراں نے کٹورا پرے رکھ دیا تھا اور بڑے غور سے پرسی کی باتیں سن رہی تھی۔ بولی:۔

"ارے بچے! تم بھی میرے بیٹے ہی ہو۔ تم اگر مجھے اپنی ماں کی طرح سمجھتے ہو تو میں بھی تم دونوں کو اپنے بچے ہی سمجھتی ہوں۔ شادی خدا رسول کا حکم ہے۔ اس حکم میں کسی کی کیا مجال جو انکار کرے۔ یہ شبھ کام ہے۔ میں ضرور اد کاڑے جاؤں گی۔ خدا کرے کہ یہ کام ہو جائے۔ پھر چاہیئے مجھے جوڑا بنوا دینا۔"

"ضرور چاچی! تمہارا جوڑا الٰہی مہر ہوگا۔"

"کس دن جانا ہوگا۔"

میں نے کہا:۔

"جس روز تمہارے کام کاج کا حرج نہ ہو۔"

خیراں بولی:۔

"ارے بیٹا یہ نیک کام ہے۔ اس کے لئے اگر کام کا حرج بھی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ میں تو کل ہی جانے کو تیار ہوں۔"

پرسی بولا:۔

"کل نہیں چاچی! کل ہمیں لڑکی کے والدین کے لئے جوڑوں کا کپڑا خریدنا ہے پرسوں پر رکھ لو۔ پرسوں صبح تم خدا کا نام لے کر چلی جانا۔"

"جیسے تمہاری مرضی بیٹا! میں تو اپنے بچوں کی خدمت کے لئے ہر گھڑی تیار رہوں۔"

میں اور پرسی خوش خوش اپنی کوٹھڑی میں آ گئے۔ رات گئے تک ہم شادی کے بعد کی زندگی پر باتیں کرتے رہے۔ پرسی نے کہا:۔

"یار پھر تو تم مجھ سے بھی جدا ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا:۔

"تم سے نہیں پرسی۔ اس کوٹھڑی سے جدا ہو جاؤں گا۔ بھلا اپنے یاروں سے بھی کوئی جدا ہوا کرتا ہے؟"

پرسی مسکرا کر کہنے لگا:۔

"پیارے سبھی یہی کہا کرتے ہیں۔ لیکن بیاہ کے بعد کبھی بھول کر بھی خبر نہیں لیتے کہ میاں کس حال میں ہو؟ عورت گھر میں داخل ہو کر مرد کی ایسی مشکیں کستی ہے کہ سوائے گھر کے اور سب رستے بھول جاتا ہے۔"

میں نے تسلّی آمیز لہجے میں کہا:۔

"تم فکر نہ کرو پرسی! میرے ساتھ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ بلکہ تم اگر چاہو تو بے شک میرے ہی گھر میں اُٹھ آنا۔"

"نہیں یار! دوسروں کی شادی شدہ زندگی میں کبھی دخل نہیں دینا چاہیئے۔ میاں بیوی کو تو ہمیشہ الگ تھلگ ہی رہنا چاہیئے۔ لیکن ایک بات بتاؤ تم نے مکان کی فکر بھی کی یا نہیں؟"

"کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا مکان پہلے شادی کی بات طے ہو جائے۔"

پرسی نے سگریٹ جلایا اور ڈبیا میری طرف پھینک کر بولا:۔

"جانی یار! میں نے سُنا ہے شادی کے بعد آدمی کا خرچ بہت بڑھ جاتا ہے۔ ابھی تو تم اکیلے ہو گے۔ کل کلاں خدا رکھے تمہارے بال بچے ہو گئے تو تم اتنی کم تنخواہ میں کیسے گزارہ کرو گے؟"

میں نے سگریٹ سلگا کر دیا سلائی زمین پر پھینکتے ہوئے کہا:۔

"روزی دینے والا خدا ہے پرسی۔ جو پیدا کرتا ہے وہ روزی بھی ضرور دیتا ہے۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں جانی! مگر آدمی کو بھی کچھ تردّد کرنا ہی پڑتا ہے اگر تم ہاتھ توڑ کر گھر بیٹھ جاؤ تو خدا تمہارے بچوں کو کبھی روزی نہیں دے گا۔"

میں نے کہا:۔

"میں نے اسی لئے پڑھنا شروع کر رکھا ہے۔ اب میں انگریزی کے حروف اٹھا لیتا ہوں۔ میں ساری عمر اس نوکری پر تھوڑے رہوں گا۔ خدا نے چاہا تو میں شادی کے بعد بہت جلد کوئی اچھی سی نوکری تلاش کر لوں گا"

پرسی نے کمبل اوپر کرتے ہوئے کہا:۔

"اچھا بھائی خدا اچھا کرے اب تو نیند آرہی ہے"

میں نے بھی کھیس اوپر لے لیا۔

"لالٹین بجھا دوں؟"

"بجھا دو سالی کو"

دوسرے روز سینما سے ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر میں اور پرسی دلی دروازے کے اندر کپڑا خریدنے گئے میں نے پائی پائی جوڑ کر دو کم چار سو روپے قلندر ہوٹل کے مالک کے پاس جمع کروا رکھے تھے۔ اس کا پرسی کو بھی علم نہ تھا۔ اس نے جب مجھ سے پوچھا تھا کہ شادی پر روپے کہاں سے آئیں گے تو میں نے اسے یہی کہا تھا کہ میں سینما والوں سے سو دو سو قرض لے لوں گا اور پھر میں بڑی سادگی سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ صرف دو کپڑوں میں دلہن کو گھر لے آؤں گا۔ اُس روز میں نے قلندر ہوٹل کے مالک قریشی صاحب سے چالیس روپے لئے اور پرسی کے ساتھ کپڑا خریدنے چل پڑا۔ پرسی بولا:۔

"یار اس نے تمہیں پلک جھپکنے میں روپے دے دیئے۔ دگرنہ یہ تو اپنے سگوں کو بھی قرض نہیں دیتا"

میں نے بھی بات چھپا کر کہا:۔

"بس یار اس کے دل میں خدا نے مہر ڈال دیا"

زنانہ کپڑوں کی ہم دونوں کو کچھ زیادہ شُدبُد نہ تھی۔ یونہی اٹکل پچو ہر دکان پر کپڑا دیکھنے کھڑے ہو جاتے۔ جب ایک دکاندار نے معلوم کیا کہ ہمیں مدبر عورت کے لئے جوڑا چاہیئے تو اس نے نسواری رنگ کی چھوٹے پھولوں والی وائیل کا ایک ٹکڑا کاٹ دیا

اس کے بعد ہم نے شلوار کے لئے ٹاسا خریدا۔ بالی کے والد کے لئے دھوتی قمیض، زرد رنگ کا بڑا رومال اور ایک تولیہ خریدا۔ بادام اور چھوہارے خریدے اور چیزوں کی گٹھڑی اٹھا کر واپس کٹڑی میں آگئے۔

تیسرے روز جمعے کا مبارک دن تھا۔ میں نے چاچی خیراں کو بالی کے باپ کی دکان بازار اور محلے کا پورا پورا پتہ لکھ دیا۔ وہ خود بھی اس محلے سے واقف تھی اور کئی بار وہاں جا چکی تھی۔ کپڑوں کی گٹھڑی اور بادام چھوہاروں کی سینی ساتھ کی۔ اوکاڑے کا ٹکٹ لے کر پانچ روپے خیراں کو دیئے اور اس کو اوکاڑا جانے والی بس پر سوار کرا کر رخصت کر دیا۔ بس روانہ ہو گئی تو ہم دونوں واپس سینما میں آگئے۔ پرسی پینٹنگ روم میں چلا گیا اور میں منیجر کے دفتر کے باہر آکر سٹول پر بیٹھ گیا۔

میں نے چاچی خیراں کو تاکید کر دی تھی کہ شام کو ہی آخری بس یا ریل گاڑی میں واپس آجائے لیکن وہ رات کو بھی واپس نہ پہنچی۔ تندور پر اس کی بیٹی بیٹھی روٹیاں لگا رہی تھی۔ دو تین بار میں اور پرسی اس کے پاس خیراں کا پوچھنے گئے۔ ہر بار وہ مسکرا کر اور کچھ شرما کر یہی کہتی:۔

"بی بی ابھی نہیں آئی۔"

بی بی نے وہاں جا کر پاؤں پسار لئے تھے اور ادھر ہمارے دل پریشان ہو رہے تھے۔ دل کو قسم قسم کے وسوسوں نے گھیر رکھا تھا۔ کبھی خیال آتا بالی کی ماں نے رشتہ قبول نہیں کیا پھر سوچتا اگر ایسی ویسی بات ہوتی تو خیراں دوسری ہی بس میں واپس آچکی ہوتی۔

"جانی! منہ میٹھا کراؤ بیٹا۔ بات پکی ہو گئی ہے۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے پرسی! میں تمہارا منہ لڈوؤں سے بھر دوں گا۔"

پرسی نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا:۔

"ارے بھئی اگر بات پکی نہ ہو گئی ہوتی تو خیراں کو وہاں رات رہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے تو فوراً ہی واپس آجانا چاہیئے تھا۔"

میں نے تشویش کرتے ہوئے کہا:۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بالی کی ماں نے انکار کرنے کے بعد کہہ دیا ہو کہ اب آئی ہو تو رات یہیں رہ جاؤ۔"

پرسی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"یار تم نرے عاشق ہی ہو۔ تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ بیٹے شادی سے پہلے یہ حال ہے تو شادی کے بعد کیا ہوگا!"

اگرچہ پرسی کی باتوں نے میری کافی ڈھارس بندھائی تھی اور عقل بھی یہی کہتی تھی کہ بات کچھ بن ہی گئی ہے۔ اس کے باوجود میں رات بھر بے چین رہا اور بڑی مشکل سے نیند آئی۔ صبح اٹھتے ہیں اور پرسی چاچی خیراں کے تندور پر گئے۔ معلوم ہوا کہ بی بی ابھی تک لاہور نہیں پہنچی۔ نا امید ہو کر ناچار سینما آ گئے پرسی نے کہا:

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ چاچی گیارہ بجے سے پہلے نہیں آتی۔ بہرحال ہم پورے ساڑھے گیارہ بجے چل کر پتہ کریں گے۔"

گیارہ بجے تک میں سٹول پر بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ کبھی اٹھ کر سینما کی لابی میں ادھر اُدھر گھومنے لگتا۔ پھر آ کر بیٹھ جاتا۔ گو گیٹ کیپر نے ایک بار پوچھا بھی۔

"کیوں بھئی جانی! آج سٹول پر ٹکتے نہیں ہو۔ کسی دلدار کمنداں والے کا انتظار ہے۔"

میں نے ہنس کر بات ٹال دی۔ پورے گیارہ بجے تو میں مینجر صاحب سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی کھانے کی چھٹی لے کر پرسی کے پاس آ گیا۔ استاد نے مجھے دیکھ کر کہا:

"کیوں بھئی گرد گھسے اکیا بھاڑ پک رہی ہے آج کل؟"

بڑی مشکل سے پرسی کو وہاں سے نکلوا کر میں نے ساتھ لیا اور بلے شاہ کے تندور پر آ گئے۔ وہاں چاچی خیراں کو آٹا گوندھتے دیکھا تو میری جان میں جان بھی آئی اور کچھ جان نکل بھی گئی۔ خوشی بھی ہوئی اور دل کو دھڑکا بھی لگ گیا۔ خدا جانے یہ عورت دماغ میں کیا خبر چھپائے بیٹھی ہے۔ میں اس سے آنکھیں چار کرتے گھبرا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ پھر، اس کی آنکھیں پڑھ لوں گا۔ ہمیں دیکھ کر چاچی خیراں مسکرا دی۔ میرا چہرہ خوشی سے

نکھر گیا۔ ہم پاس جا کر بیٹھے تو وہ ہنس کر بولی :-

" لو اب پہلے منہ میٹھا کراؤ۔ خدا نے بات جوڑ ہی دی ہے "

میرے منہ سے تو خوشی کی چیخ سی نکل گئی۔ میں بھاگم بھاگ چوک میں گیا اور لڈو خرید لایا۔ میں نے لڈو خیراں کی طرف بڑھائے۔

" پہلے تم بسم اللہ کرو چاچی "

" خدا برکت ڈالے۔ جوڑی سلامت رہے "

اس کے ساتھ ہی خیراں نے ایک لڈو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور پھر آٹا گوندھنے لگی ساتھ ساتھ وہ ہم سے باتیں کرتی۔ اس نے بتایا کہ وہ سیدھی بیبنی سر پر اٹھائے میاں اللہ بخش کے گھر جا پہنچی۔

" پہلے تو وہ لوگ مجھے دیکھ کر حیران سے ہوئے۔ پھر جب میں نے تمہارا نام لیا تو خاموش ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح بٹھلایا۔ خیر خیریت پوچھی۔ میں نے پانی وغیرہ پی کر بات کر دی۔ اور بات کرنا تو پھر کوئی ہم سے سیکھے۔ جانی بیٹا ایسی باتیں کیں کہ وہ لوگ بس قائل ہو کر رہ گئے۔ میں نے کہا کہ ایسا لڑکا تو لاکھوں میں ڈھونڈو تو نہیں ملے گا۔ شریف ہے۔ برسر روزگار ہے۔ پڑھا لکھا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بالکل اکیلا ہے۔ لڑکی اکیلی بیٹھی راج کرے گی "

میں نے جلدی سے پوچھا :-

" پھر ماں جی نے کیا کہا؟ "

خیراں ہنس پڑی :-

" ارے بیٹا کہنا کیا تھا۔ میں نے بات شروع ہی اس طرح کی تھی کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ لڑکی کا باپ بھی وہیں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا میاں جی! لڑکے کی شرافت کی تو میں بھی قسم کھاتی ہوں۔ اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ جس دفتر میں وہ کام کرتا ہے۔ وہ تو اس کے گرویدہ ہیں "

میں نے بے تاب ہو کر کہا۔

" بالی کہاں تھی ؟"

چاچی خیراں اور پرسی دونوں مسکرا دیئے۔ خیراں بولی :-

" وہ تو بے چاری اتنا سنتے ہی کوٹھڑی میں جا چھپی۔ ارے جانی! لڑکی تو مجھے بھی بڑی اچھی لگی۔ کیا بھولی بھالی سی ہے۔ شادی کے بعد تو میں روز اس سے ملنے جایا کروں گی "

میں نے کہا :-

" تم نے جوڑے دے دیئے پھر ؟"

" ارے بیٹا تو کیا میں نے اپنے پاس رکھ لئے ہوں گے "

" نہیں نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا چچی۔ میں یہ نہیں کہتا ...."

" ارے ہاں میں سمجھتی ہوں۔ جانتی ہوں۔ میں نے انہیں جوڑے دکھلائے تو بڑے خوش ہوئے۔ ٹاسے کی شلوار دیکھ کر تو بڑی بی حیران رہ گئی "

خیراں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ شام کو کوئی جواب دیں گے چاچی خیراں کھانا کھا کر کوٹھڑی میں دراز ہو گئی اور ادھر دونوں میاں بیوی آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ شام کو بالی کی ماں نے خیراں کو خوشخبری سنائی کہ انہیں یہ رشتہ منظور ہے۔ لیکن پہلے لڑکے کو اپنا ایک الگ گھر کرائے پر لینا ہو گا۔

" ہمیں زیور کپڑے کی پرواہ نہیں بہن! لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہماری بچی جہاں بھی رہے باعزت چار دیواری میں رہے اور اس کی ہر خوشی کا خیال رکھا جائے ویسے تو یہ باتیں نصیب کی ہوتی ہیں۔ پھر بھی ہم نے اپنی بچی کو بڑے پیار سے پالا ہے "

خیراں نے انہیں یقین دلایا کہ لڑکا ایک الگ مکان بہت جلد کرائے پر لے رہا ہے۔ اور وہ اسی گھر میں جا کر شادی کرے گا۔ اس کے بعد انہوں نے چاچی خیراں کو دودھ پلایا اور رسمی طور پر شادی کی بات طے ہو گئی۔ خیراں نے تاریخ مقرر کروانی چاہی

تو ماں جی نے کہا :۔

" ہم خود بیٹی کے فرض کو جلدی ادا کر دینا چاہتے ہیں بہن۔ لیکن جب تک اس کا بھائی کویت سے نہیں آجاتا۔ ہم تاریخ کیسے دے سکتے ہیں ؟"

خیراں نے پوچھا :۔

" بیٹے کے آنے کی کب تک امید ہے ؟"

ماں جی نے کہا :۔

" ہم اسے خط لکھیں گے۔ وہ بہت جلد بھی آیا تو دو تین ماہ سے پہلے کیا آئے گا "

" پھر بہن میں آکر سنبہ کر جاؤں گی "

" ضرور آنا بہن تمہارا اپنا گھر ہے "

" اچھا بہن تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔ لو خدا حافظ۔

سلاوا ں علیکم "

چاچی خیراں کا منہ میٹھا کروانے اور اس سے ایک ایک بات کی تفصیل سننے کے بعد میں اور پرسی واپس سینما آگئے اور اپنے اپنے کام پر جا کھڑے ہوئے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ مجھے آج پہلی بار اس دنیا کے میلے میں اپنی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری زندگی بیکار کی زندگی نہ تھی بلکہ اس کا بھی ایک مقصد تھا۔ اس کی بھی ایک افادیت تھی اور اس نے بھی اس رزم گاہِ حیات میں ایک اہم رول ادا کرنا تھا۔ میں تصور کرتا کہ بالی دلہن بنی پلنگ پر بیٹھی ہے اور میں اس کے مالک، اس کے ہونے والے بچوں کے باپ اور اس گھر کے بادشاہ کی حیثیت سے کمرے میں داخل ہو کر اس کا گھونگھٹ اٹھا رہا ہوں۔ اس وقت بالی کی آنکھوں میں خوشیوں کے طوفان امڈ پڑے ہوں گے۔ وہ کتنی مسرت کے ساتھ نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھے گی۔

پھر مجھے اس وقت کا خیال آتا جب ایک چھوٹا سا بچہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بھاگ کر میری طرف آئے گا اور "ابا" کہہ کر میری آنکھوں سے لپٹ جائے گا۔ کیا صوفی ہوٹل کی

دوسری منزل میں گندے پرنالے کے قریب جھلنگا چارپائی پر زخمی ٹانگ لئے پڑا رہنے والا بے یارو مددگار رلٹر کا کبھی اتنا خوش قسمت بھی ہو سکتا ہے؟ میں اپنے نصیبے پہ رشک کرنے لگا تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھ یتیم اور بے آسرا کی بھی سن لی اور اس قابل بنایا کہ آج بارہ پتھر دور ایک عورت مجھے اپنا داماد بنانے پر راضی ہو گئی ہے۔

دو روز بعد بالی کا خط آیا۔ یہ خط لمبا تھا۔ اس خط کا ایک ایک لفظ خوشی سے رقص کر رہا تھا۔ ایک ایک سطر سے خوشبو کی مہک اڑ رہی تھی۔ جگہ جگہ اس نے میرا نام لکھا تھا۔ بالی نے لکھا تھا کہ اس کی خوشی بیان سے باہر ہے اور وہ بے تابی سے اپنے بھائی کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے جس کی آمد کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری ہو جائے گی۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے یقین نہیں آ رہا کہ ماں جی اور میاں نے شادی کی رضامندی دے دی ہے اور بات پکی ہو گئی ہے۔ میں نے اسے جواب میں لکھا کہ وہ بھائی کو خط لکھے کہ وہ جلدی پاکستان آ جائے۔ مجھ سے یہ دو مہینے نہیں گزارے جاتے۔

بالی نے لکھا:۔

"کیسی باتیں لکھ رہے ہو۔ میں بھلا بھائی سے کیسے کہوں کہ وہ جلدی پاکستان آ جائے۔ مجھے ایسا لکھتے ہوئے لاج نہیں آئے گی کیا؟ بھائی میرے بارے میں کیا سوچے گا۔ تم زیادہ بے تاب نہ ہو جاؤ۔ انشاء اللہ میرے سچے پیر نے چاہا تو وہ دن بھی جلد آ جائے گا جب ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہ رہے ہوں گے۔"

میں نے پرسی کے ساتھ مل کر لاہور میں مکان کی تلاش شروع کر دی۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد سنت نگر میں جو کسی زمانے میں ہندوؤں کا علاقہ تھا ایک مکان کی اطلاع ملی۔ ہم دونوں وہاں پہنچ گئے۔ یہ مکان سینما سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بمشکل دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک مشہور سڑک کی بغل والے پارک کے اندر جا کر واقع تھا۔ مکان کیا تھا ایک بہت بڑی پختہ عمارت کی آخری منزل پر جا کر کونے والے دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ غسل خانہ وغیرہ ساتھ بنا تھا۔ باورچی خانے کا نام تک نہ تھا۔ بڑی مشکل سے ایک آدمی دو سو روپے

لی پگڑی پر تیار ہوا تھا۔ وہ خود کراچی جا رہا تھا۔ میں نے جھٹ قلندر ہوٹل والے قریشی صاحب سے دو سو روپے لے کر اس آدمی کو دے دیئے۔ اور کمرے کے باہر اپنا تالا لگا دیا۔ سرکار نے اس کا کرایہ پندرہ روپے ماہوار لگا رکھا تھا۔ پرسی نے مجھے بہتیرا کہا کہ میں اتنی جلدی نہ کروں اور پھر ابھی مکان کی اتنی ضرورت نہیں۔ لیکن میں نے کہا:

"کیا خبر وقت پر کوئی بھی مکان نہ مل سکے۔ بہتر یہی ہے کہ میں ابھی سے اس کا بندوبست کر رکھوں۔ تمہیں خبر نہیں بالی کی ماں نے الگ مکان کا خاص طور پر چچی خیراں سے کہا تھا۔"

میں نے اسی روز مکان کی خوشخبری بالی کو لکھ بھیجی۔ بالی نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ اس کا بھائی اگلے ماہ کویت سے آ رہا ہے۔ میں نے فوراً چچی خیراں کو دن مقرر کرنے کے لئے ادکاڑہ روانہ کر دیا۔

خیراں واپس آگئی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ یعنی پورے ڈیڑھ ماہ بعد جولائی کی پندرہ تاریخ کو برات لانے کے لئے کہہ دیا گیا تھا۔ میں نے پندرہ جولائی کے انتظار میں گھڑیاں اور پل گننے شروع کر دیئے۔ اس دوران میں میں اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر سنت نگر پارک والی عمارت کے مکان میں آگیا۔ دونوں کمرے آگے پیچھے بنے ہوئے تھے غسل خانہ پہلے کمرے کی بغل میں تھا اور اس کے ساتھ ہی پاخانہ بنا ہوا تھا۔ باہر چھوٹی سی گیلری تھی۔ جس پر سے گزر کر عمارت کی سیڑھیوں تک جانا پڑتا۔ میں نے دونوں کمروں کو نیلامی کی دو تین کرسیوں اور ایک میز سے سجا دیا۔ ایک پرانا ادھڑا ہوا بید کا کاوچ منیجر کی عشرت گاہ کے عقب میں پڑا رہتا تھا۔ میں نے منیجر سے کہہ کر اسے لے لیا اور اس پر مستری سے لکڑی کے تختے لگا کر روغن کروا دیا۔

یہ کاوچ میں نے پہلے کمرے میں دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

جوں جوں شادی کا دن قریب آ رہا تھا۔ میں اس فکر میں تھا کہ کسی طرح کچھ پیسوں کا بندوبست ہو جائے مگر بظاہر ایسا ہونا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اس وقت میرے پاس صرف ڈیڑھ سو روپے تھے۔ اور اتنے کم پیسوں سے کیا ہو سکتا تھا۔ میں کچھ اداس

اداس رہنے لگا۔ ایک دن میں اسی حالت میں سٹول پر بیٹھا تھا کہ منیجر آگیا۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر اسے سلام کیا۔ وہ جواب دیئے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک پل بعد اس نے گھنٹی بجا کر مجھے اندر بلایا:۔

"جی صاحب"

منیجر حسب عادت میز کے کونے پر دونوں ٹانگیں رکھے سگار پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا:۔

"جانی! کیا بات ہے میں کچھ دنوں سے تمہیں کھویا کھویا سا دیکھ رہا ہوں؟"

میں نے مسکرا کر کہا:۔

"کچھ نہیں صاحب! بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کی مہربانی ہے"

اس نے جھڑک کر کہا:۔

"بکواس بند کرو۔ صاف صاف بتاؤ۔ تمہیں کیا پریشانی ہے"

میں نے پھر بھی زبان نہ کھولی۔

"آپ کی مہربانی ہے صاحب! میں کوئی پریشان نہیں ہوں"

"تو نکل جاؤ باہر۔ مجھے کام کرنا ہے"

منیجر نے کرخت لہجے میں کہا اور فائل اٹھا کر اس کے ورق الٹنے لگا۔ میں چپکے سے باہر آکر سٹول پر بیٹھ گیا۔ دل نے کہا۔ پگلے تو نے منیجر کے سامنے حرفِ مدعا کیوں نہ بیان کر دیا۔ کیا خبر تمہاری ساری پریشانیوں کا علاج کر دیا جاتا۔ لیکن میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں منیجر کو اپنی تکلیفوں کا حال بیان کروں کچھ اداس۔ کچھ ملول سا ہو کر چپکا بیٹھا رہا۔ ایک گھنٹے بعد منیجر نے باہر نکل کر جاتے ہوئے کہا:۔

"میرا کمرہ جا کر کھول دو"

وہ چلا گیا اور میں دوسری منزل پر آکر عشرت گاہ کا کمرہ کھول کر اس کی جھاڑ پونچھ کرنے لگا۔ مجھے پلنگ دیکھ کر بالی یاد آگئی۔ وہ اس روز کتنی قابلِ رحم حالت میں بُغچی بغل میں دبائے یہاں بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ میں بالی کے ہر دکھ کا مداوا

کر کے رہوں گا۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کے تلخ دن کبھی یاد نہیں آنے دوں گا۔ اسے ہر طرح کا سکھ پہنچاؤں گا۔ اس کی خوشی اور سکھ کے لئے دن رات محنت کروں گا اور اس کے آرام کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شادی ڈیڑھ سو روپے میں کیسے ہوگی؟ ان بیسیوں میں سے تو بمشکل بالی کے لئے سونے کی دو چیزیں ہی بن سکیں گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ روپیہ کہاں سے آئے؟ میرا یہاں کون ہے؟ اگر کوئی بھی تو وہ میری طرح کا مزدور ہے میرے پاس تو پھر بھی اتنے پیسے جمع ہیں۔ اس کے پاس تو مہینے کے آخر میں ایک پائی نہیں ہوتی۔ پھر کیا ہوگا میرے اللہ!۔

اسی ادھیڑ بن میں لگا میں کمرے کی صفائی کر رہا تھا کہ منیجر اندر داخل ہوا۔ آج وہ خلاف معمول تنہا تھا اور اس کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی۔ اس نے الماری میں سے شراب کی بوتل نکال کر میز پر رکھی اور مجھے شراب اور برف لانے کو کہا۔ میں نے دوسری الماری میں سے گلاس نکال کر دھویا۔ اسے میز پر رکھا اور برف لینے چلا گیا۔ جب برف لے کر آیا تو دیکھا منیجر شراب کا ایک گلاس چڑھا چکا تھا۔ میں نے برف توڑ کر پلیٹ میں ڈالی تو باہر جانے لگا تو منیجر نے کہا:۔

"ٹھہرو"

میں وہیں رک گیا۔

"جی صاب"

اس نے سگریٹ سلگایا۔ پلنگ سے ٹیک لگائی اور لال لال سنگرفی آنکھیں بھاری پپوٹوں کے نیچے گھما کر بولا:۔

"تمہیں کیا پریشانی ہے۔ مجھ سے صاف صاف کہہ دو" میں چپکا ہو رہا اور سر جھکا لیا۔

"بولتے کیوں نہیں؟ کیا کسی عورت کو اغوا کر لائے ہو؟ کسی کو قتل کر دیا ہے؟ کہیں چوری کی ہے! آخر کیا ہو گیا ہے تم سے؟"

میں نے آہستہ سے ڈر ڈر کر کہا:۔

"صاب ایسی بات نہیں"

"پھر کیا بات ہے ؟"

"میں ـــــ میں شادی کر رہا ہوں"

میرا اتنا کہنا تھا کہ کالا بھجنگ منیجر کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پلنگ پر دوہرا ہو گیا۔ پھر سینے پر ہاتھ پھیر کر بولا :-

"تمہاری صورت سے تو یوں لگتا ہے جیسے تمہیں جیل کی سزا ہو گئی ہے اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ تم لوگ تو شادیاں کر کے بڑی آسانی سے خوش رہ سکتے ہو۔ چاہے ایک چھوڑ کر دو شادیاں کر لو"

میں نے ذرا شرما کر اور ذرا جھینپ کر کہا :-

"بات یہ ہے صاب! شادی کا دن مقرر ہو گیا ہے لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں شادی کا پورا خرچ اٹھا سکوں"

منیجر نے کرختگی سے کہا :-

"اگر پیسے پاس نہیں تھے تو شادی کیوں کرنے بیٹھ گئے ؟"

میں نے کہا :-

"پیسے تھے صاب! لیکن میں نے جو مکان کرائے پر لیا ہے۔ اس کی پگڑی پر صرف ہو گئے"

منیجر نے قہقہہ مارا۔

"لیکن اب تمہیں پگڑی کون بندھائے گا؟ ارے تیرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے کیا؟"

میں نے کہا :-

"سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی نہیں"

منیجر نے ~~ہاتھ اٹھا~~ کر کہا :-

"بس بس خدا وغیرہ کا ذکر میرے سامنے نہ کرو۔ میں خدا سے تنگ آچکا

ہوں۔ یہ کہو تمہیں کتنے روپے چاہئیں ؟"
میں تو خوشی سے پاگل سا ہونے لگا ۔ تو کیا یہ کالا بھجنگ مجھے روپے دے دے گا ؟ اس کے ساتھ ہی وہ شراب کا تیسرا گلاس بھی چڑھا گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
" یہی کوئی ......"
منیجر بولا۔
"ارے کتنے روپے چاہئیں"
میں پھر خاموش رہا۔ دراصل دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا۔
منیجر نے جھڑک کر کہا۔
" اچھا اب بک بک بند کرو اور باہر جا کر بیٹھ جاؤ۔ صبح مجھ سے چیک لے لینا"
میں چپکے سے باہر آکر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ منیجر یونہی شراب کے نشے میں بول رہا تھا۔ بھلا وہ مجھے کیا دے گا۔ سوائے شراب کے دو گھونٹ کے اس نے کبھی مجھے کچھ نہیں دیا۔ یا پھر پرانا سا بیکار پڑا ہوا کاوچ خیرات کر ڈالا جس کی ایک ایک چول ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں پھر اپنی پریشانیوں میں کھو گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر اسے سلگا کر پینے لگا۔ اتنے میں سیڑھیوں میں کسی کے قدموں کی آواز گونجی۔ میں نے سگریٹ بجھا کر جیب میں ڈال لیا۔ کیونکہ میں چھوٹے منیجر کے سامنے بھی سگریٹ نہیں پیا کرتا تھا لیکن ایک ہی پل کے بعد سیڑھیوں میں ایک سفید پوش عورت نمودار ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دبلی پتلی سی لڑکی ہے۔ اس کی آنکھیں نقاب کی جالی میں چمک رہی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔ میں چونکہ ان باتوں کا عادی تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا اور خود پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔
وہ عورت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی تیزی سے اندر چلی گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور جیب سے بجھا ہوا سگریٹ نکال اسے دوبارہ سلگا کر بیٹھ گیا اور پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ کتنی ہی دیر میں اپنے تفکرات میں ڈوبا رہا۔ میں نے دو تین سگریٹ پھونک ڈالے۔ سوچا اگر منیجر نے محض شراب کی ترنگ میں وعدہ نہیں کیا تو کیا عجب وہ

صبح مجھے چیک دے ڈالے۔ اگر اس نے دو سو روپے بھی دے دیئے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ڈیڑھ سو کی دو سونے کی چیزیں بنالوں گا۔ پچاس روپے ولیمے پر لگ جائیں گے۔ سو روپے کے بالی کے لئے کپڑے بنوالوں گا اور پچاس روپے اوپر کے خرچے کے لئے کافی ہوں گے۔ مجھے کون سی بارات لے کر وہاں جانا ہے۔ چار آدمی جائیں گے اور نکاح پڑھوا کر دلہن کو ساتھ لے واپس آجائیں گے۔ میں نے قصداً سینما والوں کو شادی کی خبر نہیں کی تھی۔ ایک تو میرے پاس رقم نہیں تھی کہ میں انہیں ساتھ لے جا سکتا۔ دوسرے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ میری برات کے ساتھ جائیں جن کے ساتھ میری بیوی کی تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ یعنی جو لوگ بالی کو اچھی طرح جانتے تھے اگرچہ اس بھید کے کھل جانے کے امکانات کم تھے۔ پھر بھی کیا خبر وہاں کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔ میں نے پرسی کو تاکید کر دی تھی کہ وہ سینما والوں کو شادی کی کانوں کان خبر نہ ہونے دے، صرف منیجر کو اس کا علم ہوا تھا۔ سو اس کے لئے میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں اسے کہہ دوں گا کہ وہ کسی کو شادی کی بابت کچھ نہ بتائے۔

اچانک اندر کمرے سے عورت کے قہقہے کی آواز آئی۔ میں کچھ چونکنا ہو گیا۔ قہقہے کی آواز کچھ جانی پہچانی تھی۔ میں نے ایک عرصہ ہوا سوراخ میں سے دیدہ بازی کرنا موقوف کر رکھا تھا۔ لیکن اس مانوس آواز نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اندر جھانک کر دیکھوں اور اپنا شک رفع کروں۔ اب جو میں نے سوراخ پر آنکھ رکھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ننھی میراثن مادر زاد برہنہ کالے بھجنگ منیجر کے پہلو میں بیٹھی اسے شراب کے جام بھر بھر کر پلا رہی ہے۔ اگر بالی سے ملنے سے پہلے میں ایسا دیکھتا تو شاید دروازہ توڑ کر اندر گھس جاتا۔ لیکن اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ علاوہ ازیں مجھے اچھی طرح معلوم تھا ننھی کس قماش کی لڑکی ہے۔ مجھے صرف حیرانی ہوئی کیونکہ وہ اتنی بے حیا کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

وہ اِس قسم کی واہیات حرکتیں کر رہی تھی کہ کوئی طوائف بھی کیا کرے گی۔ مجھے گھن آنے لگی۔ یہ بدبخت اسی لائق تھی کہ میں اس کا خیال دل سے نکال دیتا اور کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اس کے بال کمر پہ کھلے تھے۔ وہ

سر سے پاؤں تک برہنہ تھی۔ جسم پر نام کو بھی کوئی چیتھڑا نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں اوپر کو اٹھی تھیں۔ پتلی کمر نے ہلکا سا بل کھا رکھا تھا۔ ٹانگ ٹانگ پر چڑھا رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں جام تھا اور ایک ہاتھ منیجر کی گردن میں حائل کر رکھا تھا۔ وہ اُسے بھی پلا رہی تھی۔ خود بھی پی رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے ٹھٹھا کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

میں نے منہ پھیر لیا اور دتّے ڈرائیور کے متعلق سوچنے لگا جس نے قوالی کی رات شراب پی کر بڑے صمیم قلب کے ساتھ نھنی کے گھر کی طرف منہ کر کے سجدے کئے تھے۔ اور اسے اپنی محبت کا واسطہ دے دے کر لکارا تھا۔ لیکن اس بے چارے کو کیا خبر تھی کہ اس کی محبوبہ صرف چند روپوں اور شراب کے گھونٹ کے عوض ایک بدصورت، بدشکل اور مکروہ صورت منیجر کی آغوش میں عریاں بیٹھی شراب کے جام لنڈھا رہی تھی۔ دراصل اس قسم کی عورتوں کے لئے یہی زندگی موزوں اور درست ہوتی ہے۔ کیونکہ انہیں اسی طرح سے روپے پیدا کرنے کی تربیت دی گئی ہوتی ہے۔ یہ عورتیں صرف روپوں کے لئے ایسا نہیں کرتیں بلکہ انہیں اس قسم کی عیاشی کی لت پڑ جاتی ہے۔ وہ اپنی عیاشی کے لئے روپیہ پیدا کرتی ہیں اور روپیہ پیدا کرنے کے لئے عیاشی کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ان رنڈیوں سے مختلف ہوتی ہیں جو محض دو وقت کی روٹی، سر چھپانے کی جگہ اور تن ڈھانپنے کے کپڑوں کے لئے اپنا جسم فروخت کرتی ہیں۔

غصّہ مجھے اس بات پر آ رہا تھا کہ اس کی ماں اپنی بیٹی کی شرافت اور پاک دامنی کی کتنی ڈینگیں مارا کرتی ہے۔ اب ذرا یہاں آ کر دیکھے تو سہی کہ اس کی لاڈلی کیا گل کھلا رہی ہے اور یقیناً وہ اپنی ماں کے کہے پر ہی یہاں آئی ہے۔ اس گناہ میں نھنی کی ماں کو بھی ضرور دخل ہوگا۔ اب میں سمجھا کہ یہ عورتیں رنگ برنگ کے ریشمی کپڑے پہن کر کیوں پھرا کرتی تھیں اور اُن کی کوٹھڑی سے ہر دوسرے روز بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو کیوں اڑا کرتی تھی۔

اب میرے کمینے دماغ میں ایک خواہش پیدا ہوئی۔ میں اس بات کے لئے بے چین ہو گیا کہ کسی طرح نھنی کو یہاں اپنا آپ دکھا دوں تاکہ اس پر ظاہر ہو جائے کہ میں نے اسے اس بدکاری کے عالم میں دیکھ لیا ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ایسا کیونکر

ہو؟ اگرچہ دروازہ اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ پھر بھی میری مجال نہ تھی کہ دروازہ کھول کر اندر چلا جاؤں۔ منیجر تو مجھے اسی وقت نوکری سے جواب دے دے گا اور نوکری کے ساتھ صبح کو جو چیک ملنے والا ہے وہ بھی غارت ہو جائے گا۔ اتنے مہنگے داموں میں نتھی کو کانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے سوراخ میں سے جھانکا۔

اب نتھی دونوں بازو کمر پر رکھے گردن پیچھے کئے کھڑی تھی اور ہمارا مکروہ صورت منیجر اپنے مخصوص انداز میں اس کے پیٹ پر منہ رکھے کتے کی طرح اسے چاٹ رہا تھا۔ میں نے منہ کونے کی طرف لے جا کر زور سے تھوک دیا اور دل میں سات بار لاحول ولا پڑھا سگریٹ جلایا اور سیڑھیوں کے جنگلے پر جھک کر پینے لگا۔ میرے ذہن میں کوئی ترکیب اندر جانے کی نہ آ رہی تھی۔ ترکیب آ بھی جاتی تو میں اندر نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس وقت چڑیا کو بھی اندر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ چلو جب وہ باہر نکلے گی تو اسے سلام کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلا دوں گا۔ سگریٹ پی کر میں پھر سٹول پر آ بیٹھا اور ان غیر ضروری خیالات سے نکل کر اپنی سوچ بچار میں گم ہو گیا۔ دیکھئے صبح کتنے روپوں کا چیک ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا منیجر کھلے دل کا آدمی ہے۔ اسے غریب لوگوں کی پریشانیوں کا احساس رہتا ہے۔ نہیں تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ مجھے دوبارہ اندر بلا کر پوچھتا کہ میں اداس کیوں ہوں؟ پریشان کیوں ہوں؟

قریباً آدھ گھنٹے بعد دروازہ کھلا۔ میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ منیجر باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے بولا:۔

"خیال رہے اندر کوئی نہ جانے پائے۔ میں ذرا نیچے جا رہا ہوں"

"بہت اچھا صاب"

میں دروازے کی طرف پیٹھ کر کے چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ دل میں انتہائی خوشی کہ قدرت نے اپنے آپ ہی موقع بہم پہنچا دیا۔ جب منیجر کی آواز سیڑھیوں میں معدوم ہو گئی اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور عشرت گاہ کے اندر

آگیا۔ نتھی پلنگ کی پٹی پر نیم عریاں بیٹھی نشے میں جھوم رہی تھی۔ شلوار اس کے ہاتھ میں تھی جس کا ازار بند تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر تو اس کا رنگ فق ہو گیا اور سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے مجھے باہر ضرور دیکھا تھا لیکن یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میں اسے اس قابلِ اعتراض حالت میں بھی دیکھ لوں گا۔

"سلاماں لیکم! سنائیے جی کیا حال ہے؟ آج تو خوب مال ملا ہو گا۔ بس میں نے سوچا، مہمان آئے ہیں۔ ذرا مزاج دریافت کر لوں۔"

نتھی نے جلدی سے پلنگ کی چادر اوپر کر لی۔ میں نے مسکرا کر کہا:

"اب اس کی کیا ضرورت ہے؟ اب اگر تم لحاف بھی اوپر کر لو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

نتھی ہاتھ جوڑ کر بولی:۔

"تم میرے ساتھ جو چاہے کر لو جانی۔ پر رب کا واسطہ ہے کٹڑی میں کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ نہیں تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

میں نے کہا:۔

"میں اتنا ذلیل نہیں ہوں نتھی! میں تمہیں اپنی جھلک دکھانا چاہتا تھا سو میں نے دکھا دی۔ اب جاتا ہوں۔ ہاں ایک بات کان کھول کر سن لو۔ منیجر کو میری بابت کچھ نہ کہنا۔"

"بالکل نہیں جانی بالکل نہیں۔ خدا کے لئے تم بھی کسی سے کچھ نہ کہنا۔"

میں ہنس پڑا اور جلدی سے باہر آگیا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور اس طرح سٹول پر اطمینان سے بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تھوڑی دیر بعد منیجر بھی آگیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے صرف اتنا پوچھا:۔

کوئی اندر تو نہیں گیا بے؟"

"نہیں صاب"

"ویری گڈ"

میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ کچھ مسکراتا۔ کچھ بڑبڑاتا، کچھ لڑکھڑاتا۔ شرابی اونٹ کی طرح بے ربط ڈگ بھرتا اندر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں جتنی دیر تک اندر رہے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد سوراخ میں سے اندر جھانک لیتا۔ صرف یہ تسلی کرنے کے لئے کہ ننھی کہیں میری بابت تو منیجر سے کچھ نہیں کہہ رہی لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی عیاشیوں میں مگن تھے۔ ہاں ننھی اب پہلے کی طرح بے تکلف اور آپے سے باہر نہیں ہو رہی تھی۔

رات کو میں نے سارا واقعہ پرسی کو سنا دیا۔ میں اسے سنانے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا۔ وہ تو حیران ہو کر رہ گیا۔ پھر ناک سکوڑ کر بولا:۔

"ان بہن کی .... فاحشہ عورتوں کا کیا اعتبار۔ ان کے لئے سارا شہر اوباش آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے اس واقعے کی خبر دتے ڈرائیور کو دینی ضروری ہے"

میں نے کہا:۔

"نہیں یار! میں نے ننھی کو قسم دی تھی کہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا"

پرسی نے ہاتھ جھٹک کر کہا:۔

"ارے لعنت بھیجو اس حرامزدی پر۔ اس کا کیا لحاظ کرتے ہو۔ میں تو کہتا ہوں۔ اس بات کی ڈونڈی پٹوا دو تاکہ ان کا یہاں سے گزرنا مشکل ہو جائے"

"نہیں پرسی! ہمیں کیا فائدہ ہو گا"

"ارے فائدہ نہ ہو گا تو نقصان بھی تو کچھ نہیں ہو گا"

پھر بولا:۔

"اچھا یار رجانی! اگر یہ سالا منیجر صبح تمہیں دو چار سو روپے دے دے تو وارے نیارے ہو جائیں۔ خدا کی قسم بڑی دھوم دھام سے شادی ہو"

میں نے کہا:۔

"یار وہ دو سو بھی دے دے تو غنیمت ہے۔"

پرسی بولا:۔

"اچھا دیکھتے ہیں صبح کیا گل کھلاتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بھول ہی جائے سالا شراب کے نشے میں تو تھا ہی۔ اور پھر ان شرابی لوگوں کی ڈینگوں کا کیا اعتبار۔ یہ تو پل میں لاکھوں کی باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور پل میں فقیروں کی ٹولی میں شریک خدا کے نام پر بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ یار جانی! ان شرابیوں کا بھی باوا آدم نرالا ہوتا ہے۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ یہ لوگ گھڑی میں تولہ اور پل میں ماشہ کیوں ہو جاتے ہیں؟"

میں نے ہنس کر کہا:۔

"بھلا میں کیا جانوں۔"

"بچو! تم بھی تو چسکی لگا لیا کرتے ہو۔"

"ایسے تو تم بھی کبھی کبھی منہ مار لیتے ہو۔"

پرسی نے ایک طویل جمائی لے کر ٹھنڈا سانس بھر کر کہا:۔

"اچھا یار کبھی خدا نے چاہا تو ہم دن رات شرابیں پیا کریں گے۔"

جب میں نے پرسی سے کہا کہ شراب بری شے ہے۔ اسے پی کر انسان اپنی عقل اور تمیز کھو بیٹھتا ہے تو اس نے ناک سکوڑ کر کہا:۔

"میں نے ایسے آدمی بھی دیکھے ہیں جو عمر بھر شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے لیکن گدھے جتنی بھی عقل اور تمیز نہیں ہوتی اور ایسے بھی دیکھے ہیں جنہیں گھاس کھانا چاہیئے۔ مگر وہ شراب پیتے ہیں اور شہالو کی دکان میں بیٹھ کر ٹکے اڑاتے ہیں۔"

صبح کو میں اپنی نوکری پر آن حاضر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ منیجر شراب کے نشے میں بھری ہوئی حامی کو بھول گیا ہوگا۔ اسے یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ کل اس نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ لیکن جب کوئی بارہ بجے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر چار سو روپے کا چیک دیا تو

میں حیران رہ گیا۔ خوشی سے میرا ہاتھ کانپنے لگا۔

"بس میں اتنے پیسے ہی دے سکتا ہوں۔ میری طرف سے کوئی تحفہ لے کر بھابی کو دے دینا۔ اچھا اب جاؤ مجھے کام کرنا ہے۔"

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ منیجر کا شکریہ کس زبان سے اور کن الفاظ میں ادا کروں۔ کیونکہ اس کی اس مہربانی نے میرے سارے مسئلے حل کر دیئے تھے اور میری ساری مشکلیں آسان ہو گئی تھیں۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"منیجر صاب آپ کا......."

منیجر نے بھنویں سکیڑ لیں۔

"میں نے کہا تھا یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ مجھے کام کرنا ہے۔"

میں باہر آ گیا۔ میں اس کی طبیعت سے بخوبی واقف تھا۔ میں جانتا تھا۔ وہ کسی کی زبان سے اپنی تعریف نہیں سن سکتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دوسروں کے منہ سے اپنی اچھائیاں سن کر اسے اپنی برائیوں کا خیال آ جاتا تھا۔ میں چپکے سے باہر سٹول پر بیٹھ گیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ چیک قمیض کی جیب میں اچھل اچھل کر باہر آ رہا تھا اور اس کے پیچھے میرا دل خوشی سے مچل رہا تھا۔ میں ایک بجے کا انتظار کرنے لگا جب کھانے کے وقفے میں میں پرسی کو جا کر خوش خبری سنا سکوں گا۔

پونے ایک بجے منیجر باہر نکل گیا۔ میں بھاگم بھاگ پرسی کے پاس پہنچ گیا۔ پرسی نے میرے کھلے ہوئے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ بات توقع سے بڑھ کر ہوئی ہے۔ جب میں نے اسے چار سو روپے کا چیک دکھایا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔

"یار یہ منیجر تو بڑا اکھڑ آدمی نکلا۔ چلو یار تمہارا کام بن گیا۔ اب تو کوئی پریشانی نہیں رہی ناں۔"

"کوئی نہیں پرسی۔ خدا کا شکر ہے۔ اس کا فضل ہو گیا ہے۔"

اب بابی کا مسکراتا ہوا چہرہ مجھے اپنے بہت قریب نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے ریشمی گالوں اور خوبصورت گردن کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔ دوسرے روز میں نے بنک

میں نے جا کر چیک بھنا لیا اور سارے کے سارے پیسے لا کر قلندر ہوٹل کے مالک قریشی صاحب کے پاس جمع کروا دیئے۔ شادی میں صرف بیس روز رہ گئے تو میں نے قریشی صاحب کی وساطت سے صرافہ بازار سے بالی کے لئے کانٹوں کی جوڑی اور دو معمولی سے کنگن بنوا لئے۔ یہ زیورات بھی قریشی صاحب کے ہاں رہنے دیئے۔ اس کے بعد میں نے بالی کے لئے ہلکے قسم کے تین سوٹ تیار کروا لئے۔ اپنے کپڑے بنوائے۔ نیا جوتا خریدا مکان میں سفیدی کرائی۔ اب میرے پاس صرف دو سو روپے باقی بچے۔ رقم شادی کے دیگر لوازمات کے لئے کافی تھی۔ لیکن ولیمے کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ پرسی نے مشورہ دیا کہ ولیمے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔

"ہمارے مذہب میں ولیمے کے بغیر شادی ناجائز ہوتی ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں چار دوستوں کو گھر بلا کر تھوڑا بہت کھانا کھلا دوں۔ پوری دیگ پکوانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔"

شادی کا دن بھی آ گیا۔

اس دن مجھے دنیا کی ہر شے پہلے سے زیادہ خوب صورت اور دل کش معلوم ہو رہی تھی۔ میں چند معتبر آدمیوں کی برات لے کر کسی باجے گاجے کے بغیر چپکے سے اوکاڑہ پہنچ گیا۔ دوسرے روز میں بالی کو ساتھ لئے واپس اوکاڑہ آ گیا۔ بالی کے بھائی نے کویت سے خریدی ہوئی ایک قیمتی گھڑی۔ چھ ریشمی جوڑے۔ ایک مٹی کے تیل والا چولہا دیا تھا۔ ان چیزوں کے علاوہ وہ اپنے ساتھ تھوڑے سے برتن بھانڈے، سرخ لحاف تکیئے کھیس، ایک میز دو کرسیاں، نعمت خانہ اور ایک پلنگ بھی لائی تھی۔ میں نے پرسی اور دوسرے مزدوروں کے ساتھ مل کر یہ سامان سبحان منزل کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔ پلنگ باہر گیلری کی طرف سے رسے کی مدد سے اوپر کھینچنا پڑا۔ پرسی نے کہا۔

"تھوڑی سی شراب پی کر دلہن کے پاس جانا جانی۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

پرسی نے میرے بیاہ کی خوشی میں شراب پی رکھی تھی اور نشے میں آتش پارے کی طرح

جھوم رہا تھا۔ اور ہر کام اتنی تیزی سے کر رہا تھا کہ میں حیران ہو رہا تھا۔ میں نے شراب پینے سے انکار کر دیا۔ میں بالی کو، اپنی سب سے پیاری محبوبہ کو یہ اثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں شراب بھی پیا کرتا ہوں۔ میں خوشی سے اچھلتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ بالی کناری لگے چمکیلے سرخ کپڑوں کی گٹھڑی بنی پچھلے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی تھی۔ کرائے پر لایا ہوا پنکھا تیزی سے چل رہا تھا۔ تیز ہوا میں اس کا سرخ آنچل پلنگ کی پٹی پر نیچے لہرا رہا تھا۔ میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بالی سمٹ گئی۔ میں نے خشک اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا:۔

"آج تم میری ہو بالی! آج میرا خواب پورا ہو گیا۔ کیا آج بھی مجھ سے شرماؤ گی؟"

بالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے بالی کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

"اپنے خوب صورت چہرے کو مجھ سے دور نہ کرو بالی! میں تو اس چہرے کو دیکھنے کے لئے دن رات تڑپا کرتا تھا۔"

بالی نے آہستہ سے چہرہ پھیر کر مجھے دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر شرما گئی۔ وہ انتہائی حسین معلوم ہو رہی تھی اس نے سولہ سنگار کر رکھا تھا۔ اس کا سانولا رنگ گلابی ہو کر پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرمہ، گالوں پر پاؤڈر، لبوں پر سرخی، کانوں میں سونا۔ ناک میں سونے کا چمکیلا لونگ۔ بجلی کی روشنی میں وہ چاند کی طرح چمک رہی تھی۔ کلائیوں میں اس نے پھولوں کے گجرے باندھ رکھے تھے۔ خاکی گہری خوشبو سے میں مست ہوا جا رہا تھا۔ میں شرابی کی طرح بالی پر اپنے آپ ہی جھک گیا۔ بالی نے میرا سر اپنے مہندی لگے خوشبودار ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کے بعد ہم دونوں کو کسی بات کا ہوش نہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو میں بالی کی آغوش میں تھا اور وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مجھ پر جھکی مسکرا رہی تھی۔

"اُٹھو گے نہیں جانی! صبح ہو گئی"

میں نے سینما والوں خاص طور پر گیٹ کیپر گلو اور اپریٹر بلے سے اس شادی کو چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اسی دن سب کو پتہ چل گیا کہ جانی برات لے کر ادکاڑے گیا ہے۔ رات کو سب مبارکباد دینے اور ٹھٹھا کرنے سبحان منزل کے باہر جمع ہو گئے تھے۔ ولیمے پر ان سبھوں کو بلانا پڑا۔ مینیجر بھی میرے اصرار پر آگیا اور کھانا کھا کر واپس چلا گیا۔ پرسی کا پینٹر استاد دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بولا:-

"بچو اب معلوم ہوگا کس بھاؤ بکتی ہے۔ ہماری طرف دیکھو۔ شادی کے بعد خاک سیاہ ہو گئے ہیں۔ ارے شادی سے تو بہتر ہے کہ آدمی کوئی لونڈا رکھ لے اور اپنے آپ کو غرق کر دے"

اپریٹر لوبٹی منہ میں ڈال کر بولا:-

"جانی بیٹا! تم نے چپکے ہی چپکے ریوڑی توڑ لی ہے"

گلو کہنے لگا:-

"مگر یار شادی کہاں کی؟ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو؟"

پرسی نے فوراً کہا:-

"گلو سیٹھ ایسی باتیں نہیں پوچھا کرتے"

"کیوں اوئے! ہم اپنی بھابی کا پوچھ رہے ہیں۔ وہ ہماری بھابی ہے ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ تم ہمیں کیا سمجھتے ہو"

میں نے ادھر ادھر کی بات کر کے موضوع بدل دیا۔ بھلا میں ان لوگوں کو کیسے بتا سکتا تھا کہ میں اسی عورت کو بیاہ کر لایا ہوں جسے ان لوگوں نے ایک روز منیجر کی عشرت گاہ میں اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ دراصل مجھے ولیمے کی محفل میں گلو کا وجود انتہائی ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔ میں ان دونوں کو کسی بھی حالت میں اپنے گھر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن مجبوراً انہیں برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

میری شادی شدہ زندگی کا دور شروع ہو گیا۔

بالی میری ہر بات کا بڑا خیال رکھتی۔ صبح صبح میرے لئے لسی بناتی۔ پراٹھے پکاتی

دوپہر کو کھانا تیار کرنی شروع شروع میں اُسے برقعہ اوڑھا کر عجائب گھر اور باغ جناح کی سیر کو بھی لے گیا لیکن پھر اسے باہر لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ یونہی دل میں ایک وہم سا لگا رہتا کہ کہیں گلو یا بلا یا کوئی اور اسے پہچان نہ لے۔ مجھے اپنی گھریلو زندگی انتہائی عزیز تھی۔ زندگی میں مجھے پہلی بار گھر کا سکھ، آرام کا کھانا اور پلنگ پر ایک گداز جسم محبت کرنے والی عورت کا پہلو نصیب ہوا تھا۔ میں ہر قیمت پر سکون ماحول کو زندہ رکھنا چاہتا تھا اور معمولی سی غلطی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جو میری چھوٹی سی خوشگوار دنیا کو نیست و نابود کر کے رکھ دے۔ بالی کے ماں باپ اور بھائی ملنے آتے تو میں ان کی خوب آؤ بھگت کرتا اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔ بالی نے مجھے سکھ اور خوشی دی تھی اور میں اس کی خوشی کے لئے اپنی خوشی بھی قربان کر سکتا تھا۔ بالی کو سینما دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں اسے شہر کے دوسرے سینما گھروں میں لے جاتا۔ مگر اپنے سینما میں کبھی نہیں لے گیا تھا۔ بالی کو بھی اس بھید کا علم تھا چنانچہ وہ مجھے کچھ نہ کہتی

ایک سال ہنسی خوشی میں گزر گیا۔ بالی کے کوئی بچہ نہ ہوا۔ بالی کو فکر لاحق ہوا۔ اس نے مجھ سے ذکر کیا کہ کسی حکیم کا مشورہ لیا جائے۔ میں نے دو تین حکیموں کو دکھلایا۔ ہسپتال بھی اسے لے گیا۔ سب نے یہی کہا کہ ایسی کوئی خرابی کی بات نہیں وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد بالی کی کچھ ایسی باتیں مجھ پر عیاں ہونے لگیں جو مجھے پسند نہیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ صبح دیر تک سوئی رہتی اور چولہے میں آگ جلا کر چائے کے لئے پانی مجھے گرم کرنا پڑتا۔ برتن بھانڈے مجھے مانجھنے پڑتے۔ گھر میں وہ ہر وقت خوب بنی ٹھنی رہتی اور سنگار پر بڑا وقت اور پیسے خرچ کرتی۔ میری تنخواہ اب زیادہ ہو گئی تھی۔ کیونکہ اب میں چپڑاسی نہیں رہا تھا۔ بلکہ منیجر کی مہربانی سے بکنگ کلرک ہو گیا تھا۔ بالی ہر ماہ کریم پاؤڈر اور کنگھی چوٹی کے ساز و سامان پر تیس چالیس روپے خرچ کر ڈالتی۔ گھر کے کام کاج سے جی چراتی۔ کبھی کبھی میں شام کو واپس گھر آتا تو معلوم ہوتا کہ کھانا تیار نہیں ہے۔ بالی سر درد کا بہانہ کر کے پلنگ پر لیٹی ہوتی۔

"آج نیچے ہوٹل سے کباب وغیرہ لے آؤ۔ میرا سر درد کر رہا ہے۔"

مجھے اس کی بات کا یقین نہ آتا۔ کیونکہ اس سر درد میں بھی وہ بڑی بناؤ سنگار کئے ہوئے ہوتی۔ گالوں پر پاؤڈر لگا ہوتا۔ ہونٹوں پر سرخی لپٹی ہوتی۔ نئے کپڑے پہن رکھے ہوتے ہیں اسے کچھ نہ کہتا اور چپکے سے نیچے جاکر کباب روٹی لے آتا۔ دوسری بات تھی کہ بالی کو جھوٹ کی بڑی عادت تھی۔ وہ مجھ سے ہر بات چھپا جاتی اور سچی بات کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتی کہ اس کا حلیہ بگڑ جاتا۔

میں اسے پوچھتا۔

"آج کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

وہ کہتی:۔

"کوئی بھی نہیں۔ یہاں کون آئے گا۔ بس میں اکیلی ہی اس بندی خانے میں پڑی رہتی ہوں۔"

دوسرے دن پری کی زبانی معلوم ہوتا کہ وہ تھوڑا سا مٹی کا تیل لینے میرے ہاں گیا تھا۔ حالانکہ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ پھر بھی جانے کیوں بالی مجھ سے ہر بات چھپانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ شاید اس کی یہ عادت اس کی فطرت کا حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ ایک اور بات کا بھید بھی کھلا کہ بالی شوقین مزاج عورت ہے اور سیریں کرنے اور نئی نئی سہیلیاں بنانے کا اسے بہت شوق ہے۔ سبحان منزل کی ہر عورت اس کی سہیلی تھی اور وہ میری عدم موجودگی میں مکان میں تالا ڈال کر اکثر ان کے گھروں میں بیٹھی گپیں مارتی رہتی ہے۔ جب میں آکر اسے آواز دیتا تو کسی نہ کسی کمرے سے آواز آتی۔

"چابی بھجوا رہی ہوں۔ تم کھول کر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی آئی کھانا چولہے پر پڑا ہے۔"

میں دروازہ کھول کر اندر جاتا۔ غصے میں ٹھوکر مار کر راستے میں پڑی ہوئی کسی نہ کسی چیز کو اڑا دیتا اور اکیلا ہی چولہے کے پاس بیٹھ کر روٹی کھانے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد بالی بنی سنوری آتی اور مسکرا کر کہتی۔

" حنیفہ کی ماں کے پاس بیٹھی تھی اس نے ایک حکیم کا بتایا ہے جس کی دوائی سے شرطیہ اولاد ہو جاتی ہے "

جب میں کہتا کہ اسے زیادہ ان لوگوں سے میل ملاپ نہیں رکھنا چاہیئے کیونکہ ان لوگوں کا چال چلن مشتبہ ہے تو وہ منہ پھلا کر کہتی :-

" آدمی خود اچھا ہو تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے "

جس عورت کا وہ ذکر کر رہی تھی اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ لنڈی کوتل سے سمگل کیا ہوا کپڑا منگا کر فروخت کرتی ہے اور یہ کہ اس کے ہاں مشتبہ لوگوں کا اکثر آنا جانا ہے۔ جب میں اسے مزید منع کرتا تو تڑپ کر کہتی :-

" جانی تم مجھے مار ہی کیوں نہیں ڈالتے ؟ تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس قید خانے میں بند پڑی پڑی گل سڑ جاؤں۔ تم سے تو کبھی یہ بھی نہیں ہوا کہ سیر کروانے ہی لے جاؤ۔ مجھے تو اتنی امیدیں تھیں کہ شادی کے بعد اپنے جانی کے ساتھ لاہور کی سیریں کیا کروں گی۔ لیکن تم نے تو اب سینما لے جانا بھی بند کر دیا ہے "

میں نے کہا :-

" تمہیں چادر دیکھ کر پاؤں پسارنے چاہئیں۔ میری اتنی آمدنی نہیں کہ میں ہر ہفتے تمہیں فلم دکھلانے لے چلوں۔ مانا کہ پاس مل جاتا ہے۔ مگر اس پر بھی تو ٹیکس لگتا ہے اور پھر تانگے کا خرچ۔ وہاں کی چائے پیسٹری، دس روپے تو یوں اڑ جاتے ہیں۔ اب میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں؟ کیا تمہارے لئے چوری کروں؟ ڈاکہ ڈالوں؟ "

بالی رونا شروع کر دیتی۔

" کیا میں نے اسی دن کے لئے تم سے محبت کی تھی کہ مجھ سے لڑائی جھگڑا کیا کرو گے۔ یا اللہ مجھے اس گھر سے اٹھا لو۔ ہائے ماں ...... "

مجھے روٹی بھول جاتی۔ کیونکہ میں بالی سے محبت کرتا تھا اور اسے اس طرح روتے

اور بین کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اُٹھ کر اسے دم دلاسا دینے لگا:۔

"میرا مطلب تم سے لڑائی کرنا نہیں تھا۔ بالو! میری جان بس تو تمہیں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میری آمدنی کم ہے اور تم زیادہ خرچ کرتی ہو۔ تین ساڑھے تین روپے روزانہ ہمارے کھانے پر خرچ ہو جاتا ہے۔ پھر مکان کا کرایہ ہے بجلی نلکے کا بل ہے۔ دھوبی ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری کریم کی شیشیاں اور پاؤڈر کے ڈبے ہیں۔ خدا کے لئے ذرا عقل مندی سے کام لو۔ یہ گھر میری جنت ہے۔ اسے جہنم مت بناؤ۔"

بالی نے مزید رونا شروع کر دیا

"کیا میں کریم بھی نہ لگاؤں؟ صاف کپڑے بھی نہ پہنوں؟ تم تو میری جان کے دشمن ہو گئے ہو۔ تم تو یہ چاہتے ہو کہ میں گندی گھٹڑی بنی گھر میں ہانڈی روٹی ہی کرتی رہوں اور بوڑھی ہو جاؤں۔ کسی کے پاس بھی نہ جایا کروں۔ اگر میں کسی پاس جاتی ہوں تو اپنی اولاد کے لئے ہی جاتی ہوں کہ شاید خدا مہربانی کر دے ......"

میں گندے تولئے سے ہاتھ پونچھ کر باہر نکل جاتا۔ بالی نے کبھی گھر پر کپڑے نہ دھوئے تھے۔ وہ روٹی کا رومال بھی دھوبی کو دھونے کے لئے دے ڈالتی۔ اس نے مجھے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ میں ریڈیو خریدوں کیونکہ اکیلے اس کا گھر میں جی نہیں لگتا:۔

"صغراں کے ہاں کتنا پیارا ریڈیو ہے۔ وہ سارا دن بیٹھی سیلون سے گانے سنا کرتی ہے۔ تم ریڈیو کیوں نہیں لاتے؟"

میں نے کہا:۔

"صغراں کا باپ وکیل کا منشی ہے۔ وہ ہر موکل سے رشوت لیتا ہے۔ میں معمولی بکنگ کلرک ہوں۔ میں تو ٹکٹوں کی بلیک بھی نہیں کرتا۔"

بالی نے تنگ آکر کہا:۔

"تو بلیک کیوں نہیں کرتے؟ تم خود بزدل ہو۔ تم ڈرتے رہتے ہو۔

جب ساری دنیا بلیک کر کے روپیہ کما رہی ہے پھر تم میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو۔ بلیک کرو اور مجھے ریڈیو دلا دو۔"

چنانچہ وہی کرنا پڑا۔ میں نے کلوگیٹ کیپر سے مل کر ٹکٹوں کی بلیک شروع کر دی اور بالی کے ریڈیو کے لئے روپے جمع کرنے لگا۔ دو ماہ بعد میں ایک پرانا ریڈیو سیٹ خرید کر گھر لے آیا۔ بالی بے حد خوش ہوئی۔ اس نے میرا منہ چوم لیا۔ مجھ سے لپٹ گئی اور رات بھر لپٹی رہی۔

ریڈیو نے بالی کو زیادہ فیشن پرست، شوقین مزاج اور نکما بنا دیا۔ اب اس نے لتا اور آشا بھونسلے کے گانوں کی نقل میں تانیں اڑانا شروع کر دیں۔ جب دیکھو آئینے کے سامنے کھڑی بال بناتے ہوئے کچھ نہ کچھ گنگنا رہی ہے۔ گھر کے کام کاج سے وہ بے پرواہ ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑا بہت کام کر لیتی۔ وہ بھی اس طرح سے جیسے کسی دوسرے کا کام کر رہی ہو۔ شادی سے پہلے بالی ایسی نہیں تھی۔ یا اگر ایسی تھی تو مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میں صرف اس کی شربتی آنکھوں، چھوٹی سی خوبصورت ناک، لمبے سیاہ بالوں آنکھوں، محبت بھری سرگوشیوں اور دبی دبی کانپتی ٹھنڈی سانسوں کو ہی بالی سمجھ رہا تھا۔ لیکن بالی صرف یہی کچھ نہیں تھا۔ یہ تو بالی کا چھلکا تھا۔ اصل بالی اس چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی تھی شادی کے بعد یہ چھلکا آہستہ آہستہ اترتا چلا گیا۔ اور ڈیڑھ سال بعد اصلی بالی نمودار ہو گئی۔ یہ بالی جھوٹ بولتی تھی۔ کام چور تھی۔ دوسری عورتوں کے قیمتی کپڑے دیکھ کر آہیں بھرنے والی تھی۔ وہ صرف عشق کرنا جانتی تھی۔ بیوی کے آداب سے بے بہرہ تھی۔ وہ بڑی اچھی معشوقہ تھی۔ بیوی بالکل نہیں تھی۔ وہ عاشق چاہتی تھی۔ جو اس کے چاؤ چونچلے دیکھے۔ اسے مال روڈ کی سیر کرواتا پھرے۔ اسے سینما گھروں اور ہوٹلوں میں گھماتا رہے۔ وہ خاوند نہیں چاہتی تھی جو اس سے اپنا کھانا پکوائے، بستر صاف کروائے قمیضوں کی مرمت کروائے اور گندے مندے رومال دھونے کو دے۔

اس دوران میں ایک روز اچانک بالی کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ کچھ روز نمونیئے میں مبتلا رہا اور ایک شام اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ بالی میرے ساتھ روتی

بیٹی اوکاڑے گئی۔ سات روز تک وہاں سوگ مناتی رہی۔ واپس آکر اس نے باپ کے غم کو میلے کپڑوں کی طرح اتار کر پھینک دیا اور پھر اسی ڈھرے پر چل نکلی۔ اس کی سج دھج، سرخی پاؤڈر کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ سات آٹھ روز پہلے اس کے باپ کا انتقال ہوا ہے۔ بالی کی ماں کو اس کے بیٹے نے کویت بلا لیا۔ وہ کویت چلی گئی۔ اوکاڑے والا مکان چھوڑ دیا۔ اب بالی ریل میں بیٹھ کر بھی سفر کرنے سے رہ گئی۔ ایک روز اس نے گلہ آمیز لہجے میں کہا:۔

"اب تو میں ریل کی سیر کرنے سے بھی رہ گئی۔ تم تو خوش ہو رہے ہوگے کہ چلو یہ ٹنٹا بھی ختم ہوا۔"

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:۔

"بالی مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں اپنا قیدی بنا کر نہیں رکھنا چاہتا۔ خدا کی قسم اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں تمہیں ساتھ لے کر ساری دنیا کا چکر لگانے چل پڑتا۔"

بالی نے ناک چڑھا کر کہا:۔

"بس بس رہنے دو زبانی محبت۔ میرا تو ایمان ہے کہ جہاں تم میرے ساتھ ہوگے میں وہاں کوئی سیر نہیں کر سکوں گی۔"

میں نے سنجیدہ ہو کر کہا:۔

"کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟"

بالی نے سر جھٹک کر منہ دوسری طرف کر لیا اور آئینے میں جھک کر اپنے بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر ڈال کر دیکھنے لگی کہ کیسی لگتی ہے۔ میں سگریٹ پھینک کر باہر نکل گیا اور پرسی کی کوٹھڑی میں جا کر شام تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ میں نے پرسی سے اپنی گھریلو پریشانی کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس میں بالی کی برائی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ سبکی کا پہلو نکلتا تھا۔ اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھے تو اپنا پیٹ ہی ننگا ہوتا ہے۔ واپس گھر آیا تو

دیکھا کہ بالی نے ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر ڈال رکھی ہے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرا کر بولی:۔

"کیسے لگتے ہیں یہ بال؟"

میں نے دل میں تشویش کرتے ہوئے اور بظاہر خوش ہو کر کہا:۔

"بہت اچھے"

اور پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ بالی ناراض ہو کر بڑبڑاتی رہی۔

"تمہیں تو میرا بناؤ سنگار زہر لگتا ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔ اب تم مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو۔ اب تم نئے نئے عشق کر رہے ہو۔ اچھا ہمارا بھی خدا ہے۔ وہ ہمیں بھی صبر دے ہی دے گا"

میں نے بالی کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں سوائے اس کے اور کسی سے محبت نہیں کرتا اور میرے دل میں سوائے بالی کے اور کسی عورت کا خیال موجود نہیں ہے لیکن اس عورت نے میری ایک نہ مانی اور یہی رٹ لگاتی رہی کہ میں اب کسی دوسری عورت کو چاہنے لگا ہوں۔ میں تھک ہار کر چپ ہو رہا اور کھیس اوڑھ کر سو گیا بالی پلنگ پر لیٹی ریڈیو کھولے سیلون سے فلمی گانے سنتی رہی اور ناخنوں پر سُرخ پالش لگاتی رہی۔ ایک بار میں نے کھیس ذرا پرے ہٹا کر دیکھا۔ وہ پلنگ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹی تھی۔ اور ہاتھ میں ایک فلمی رسالہ تھا جس پر صبیحہ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ریڈیو سیلون پر شمشاد گا رہی تھی۔

ے میرے گھنگر والے بال۔۔۔۔

میں نے آہستہ سے کہا:۔

"اب سو جاؤ بالی۔ رات زیادہ ہو گئی ہے"

بالی نے رسالہ پرے پھینک دیا اور گہرا سانس لے کر بڑی لجاجت سے بولی:۔

"تمہیں کسی سے کیا۔ تم اپنا منہ سر لپیٹے پڑے رہو"

پھر اچانک چہک کر بولی:۔

"تمہیں ڈانس کر کے دکھاؤں۔ اس گیت پر ڈانس بڑا اچھا ہوتا ہے"۔
اس کے ساتھ ہی وہ دوپٹہ پھینک کر اٹھی اور ہاتھ لہرا لہرا کر کمر مٹکا مٹکا کر ناچنے لگی مجھے اس کے ناچ سے سخت کوفت ہوئی کیونکہ وہ بالکل آوارہ عورتوں کی طرح نرت کر رہی تھی اور کسی خیالی تماش بین کو آنکھیں مٹکا کر بڑے فحش اشارے کر رہی تھی۔ میں بالی کی دل شکنی کے خیال سے کچھ نہ بولا اور چپکے سے اس کا واہیات ڈانس دیکھتا رہا۔ بالکل اسی طرح میں نے آج سے کچھ سال پہلے صوفی ہوٹل میں ایک فاحشہ عورت کو شراب پی کر اپنے عاشق کے سامنے ناچتے دیکھا تھا۔ جب بالی نے ناچنا بند کیا تو اس کا سانس پھول گیا تھا اور وہ ہانپتے ہوئے بولی:-
"اچھا تھا ناں"
"ہاں بہت خوب"
"حنیفہ کی ماں تو اس سے بھی اچھا ناچ لیتی ہے"۔
میں پریشان ہو گیا۔ کیونکہ حنیفاں کی ماں وہی لنڈی کوتل والی سمگلر عورت تھی۔ جس کا اس عمارت میں بڑا شہرہ تھا۔ یہ دبلی پتلی پینتیس سالہ مگر بڑے کسے کسائے بدن کی گوری عورت ہمارے پاس ہی تین کمرے چھوڑ کر رہتی تھی۔ وہ بے تحاشہ پان کھاتی تھی اور پڑوسی کے بیان کے مطابق وہ شراب بھی پیتی تھی۔ اس کے ہاں اکثر ایسے لوگوں کی آمدورفت تھی جو اس علاقے کے اوباش اور جرائم پیشہ لوگ تھے۔ میں نے بالی سے کہا:-
"بالی! تم اس عورت کے ہاں نہ جایا کرو۔ وہ اچھی عورت نہیں ہے"۔
"کیوں اسے کیا ہو گیا ہے۔ لوگ تو یونہی بدنام کر دیتے ہیں۔ وہ تو مجھ سے بالکل اپنی بیٹی ایسا سلوک کرتی ہے اور پھر میں اس سے ملنے تھوڑی جاتی ہوں میں تو اس کی بیٹی حنیفہ سے ملنے جاتی ہوں جو میری سہیلی ہے"۔
میں کچھ نہ بولا۔ کیونکہ باتوں میں بالی کو مات دینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ دوسرے وہ ہر بات پر بدل جاتی اور اتنی چالاکی سے جھوٹ بولتی کہ آدمی چکرا جاتا۔ رات گئے تک میں بالی، حنیفہ کی ماں، اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ

کر پریشان ہوتا رہا۔ جانے کس وقت مجھے نیند آئی اور ہیں سو گیا۔

اب جو قسمت کا چکر چلا تو ہمارے مالکوں کے ہاتھوں سے سینما نکل گیا۔ مخالف گروپ نے دعویٰ دائر کر رکھا تھا کہ سینما پر ان لوگوں کا قبضہ ناجائز ہے۔ فیصلہ مخالف گروپ کے حق میں ہوا اور انہیں سینما کا قبضہ مل گیا۔ پرانے مالک غسل خانوں کے آئینے، بالکونی اور کیبنوں کے ریشمی پردے۔ قدِ آدم تصویریں اور کپڑے لٹکانے کی سنہری ہکیں اتار کر ساتھ ہی لے گئے۔ دفتر کے قیمتی صوفے تو انہوں نے مقدمے کے رُخ کو بھانپ کر کئی روز پہلے ہی سے ہی اپنے گھر پہنچوا دیئے تھے۔ منیجر نے ناک پر انگلی پھیر کر ہم لوگوں سے کہا۔

"دوستو! ہم تو چلے۔ اب تم لوگوں کا رزق خدا کے ہاتھ میں ہے نئے مالک تم لوگوں کو ایک پل نہ ٹکنے دیں گے"۔

اور ہوا بھی یہی۔ بھینگی آنکھ والے چیچک رو نئے مالک نے آتے ہی ہم سبھوں کو ایک ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ تھمائی اور چٹکی بجا کر کہا۔

"اپنا ٹھکانہ کرو میاں۔ میں تو ان لوگوں کی بلی بھی یہاں نہیں دیکھ سکتا"۔

سوائے لمتر ٹانگ اپریٹر "بلے" اور پرسی کے استاد کے سینما کے ہر ملازم کو نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ایک ماہ بعد "بلے" کو بھی جواب مل گیا۔ پرسی بدستور استاد کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں بیکار ہو کر گھر پر آن بیٹھا۔ دو ماہ تک نوکری کی سر توڑ کوشش کی مگر کہیں بھی کام نہ ملا۔ پیشگی ملی ہوئی تنخواہ ختم ہو گئی۔ میں نے سگریٹ چھوڑ کر بیڑیاں پینی شروع کر دیں۔ گوشت چھوڑ کر دال روٹی پر گزر ہونے لگی۔ لیکن جب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو خالی دال روٹی بھی کہاں تک چل سکتی تھی۔ اس پر مستزاد جب کہ بالی نے اپنا خرچ بالکل نہ کم کیا ہو۔ وہ اسی طرح اپنا بناؤ سنگار کرتی اور آرائش کی چیزیں خریدتی۔ جب میرے پاس بھی کچھ نہ رہا تو مجھ سے بات بات پر لڑائی جھگڑا کرنے لگی۔

"آخر یوں کب تک اور کیونکر گزر ہو گی۔ میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی ہم جوان رہنا چاہتی ہوں۔ کیا میں ایک ہی سال میں بڈھی کھوسٹ بن جاؤں؟

میں نہیں جانتی مجھے کہیں نہ کہیں سے کما کر لادو۔ نہیں تو میں خود کما لوں گی۔"
میں نے پوچھا:۔
"تم کس طرح کماؤ گی؟"
"کہیں محنت مزدوری کروں گی۔ کسی کے برتن بھانڈے مانجھ لوں گی۔
آخر کسی نہ کسی طرح زندہ بھی تو رہنا ہوگا۔"
"یہ کہو کہ کسی نہ کسی طرح اپنی شوقینی تو پوری کرنی ہوگی۔ زندہ رہنے کے لئے تو دال روٹی اور تن ڈھانپنے کو تین کپڑے بہت ہیں اور اس کا بندوبست میں کسی نہ کسی طرح سے کر ہی رہا ہوں۔"
اس پر بالی پھر رونے لگی اور مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں پریشان ہو کر کمرے میں چکر لگانے لگا اور پھر بیڑی پھینک کر باہر نکل گیا۔ بالی نے اپنی ماں اور بھائی کو خط لکھا۔ اس نے تھوڑے بہت پیسے بھیج دیئے اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ میرا اپنا یہاں بہت خرچ ہے۔ کیونکہ میں نے بھی یہاں شادی کر لی ہے۔ جس طرح ہو سکے تنگی ترشی میں شریف بیویوں کی طرح زندگی گزارو۔ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ تمہارے خاوند کو کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی۔
لیکن مجھے نوکری کہیں نہیں مل رہی تھی۔ حالت بہت خراب ہونے لگی۔ جیب خالی ہو گئی۔ پرسی سے ادھار لیا۔ وہ بھی ختم ہو گیا۔ قریشی صاحب سے پچاس روپے قرض لئے۔ ان کا بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ جس روز قرض لے کر آیا بالی نے اسی روز مجھے مجبور کر کے سینما دیکھا۔ چھ روپے سینما پر خرچ ہو گئے۔ ایک روپے کا اس نے فلمی رسالہ خرید لیا۔ ایک شیشی نیل پالش کی۔ ایک کریم کی اور ایک پاؤڈر کا ڈبہ خریدا گھر آکر بولی:۔
"آج تو میں گوشت پکاؤں گی۔ کیا خبر موت کب آجائے۔ جتنی دیر زندہ ہیں کچھ کھا پی لیں۔"
نتیجہ یہ نکلا کہ پچاس روپے بمشکل پندرہ دن چل سکے۔ اب پھر میں قرض لینے چل

نکلا - دس روپے فدّن سے لئے ۔ پانچ روپے پرسی سے ادھار لئے یہ بھی خرچ ہو گئے اب لوگوں نے قرض دینا بھی بند کر دیا - پرسی بے چارے کے پاس پیسے ہوتے ہی کم تھے - وہ بھی مجبور رہ گیا - قریشی صاحب پہلی رقم کا تقاضا کرنے لگے ۔ فدّن کے چالیس روپے ہو گئے تھے ۔ اس نے دو بار میرے گھر کا چکر بھی لگایا اب میں مقروض اور پریشان ہو کر گھر میں چھپ گیا - اپنے قرض خواہوں سے منہ چھپا کر ملازمت کی تلاش میں باہر نکلتا لیکن نوکری کہیں نہیں مل رہی تھی - سب سینما گھروں میں پہلے ہی سٹاف موجود تھا - سوچا کسی دوسرے شہر میں چلا جائے ۔ بالی نے سخت مخالفت کی ۔

" میں لاہور چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی - میرا یہاں دل لگ گیا ہے "

میں نے ترش ہو کر کہا :-

" تو پھر کیا یہاں بھوکی رہو گی ؟ یہاں رہ کر کھائیں گے کیا ؟ "

بالی ماتھے کے بال جھٹک کر بولی :-

" تم میری فکر نہ کرو - میرا خدا مالک ہے - بس میں لاہور سے باہر نہیں جاؤں گی - نوکری کرنی ہے تو یہیں کرو "

میں چپ ہو کر بیٹھ گیا - دراصل میں بالی سے محبت کرتا تھا میں نے ہمیشہ اس کی خوشی کا خیال رکھا تھا اور اس کے آرام کے لئے اپنی خوشیوں کی قربانی دیتا رہا تھا مجھے اس کی دل شکنی کبھی منظور نہیں تھی - ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالی مغرور ہو گئی اور بات بات پر دبانے لگی - اس کے ردِ عمل کے طور پر میں بھی اس سے دبنے لگا تھا اور اس سے لڑائی جھگڑا کرتے ہوئے گھبراتا تھا - جب گھر کی حالت بہت خراب ہو گئی اور قرض خواہوں کے تقاضے بڑھ گئے تو میں نے بالی سے کہا :-

" اگر تم اپنا زیور گروی رکھوا دو تو اس مشکل سے چھٹکارا مل سکتا ہے جب پیسے ہوں گے زیور چھڑوا لیں گے "

پہلے تو بالی نے انکار کیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کا لاہور میں رہنا دشوار ہو رہا ہے تو بادلِ نخواستہ مجھے سونے کی چاروں چیزیں دے دیں - یعنی کانٹوں کی جوڑی

معمولی سے کنگن اور دو انگوٹھیاں۔ ساڑھے پانچ روپے فی سینکڑہ سود پر میں نے زیور ایک دکان پر رہن رکھ دیئے۔ مجھے صرف پونے چار سو روپے ملے۔ ان میں سے دو سو روپے قرض پر اُٹھ گئے۔ باقی ایک سو پچھتر میں نے بالی کو دے دیئے۔

"اس سے گھر کا گزارہ چلاؤ مگر ذرا کفایت شعاری سے۔"

لیکن بالی سے کفایت شعاری کی امید رکھنا عبث تھا۔ وہ کفایت شعاری جانتی ہی نہیں تھی۔ اس نے پہلے ہی روز اپنے نئے سوٹ پر چالیس روپے خرچ کر ڈالے۔ جب میں نے اسے ڈانٹا تو رونے لگی اور کوٹھے سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی دھمکیاں دینے لگی۔ میں نے سر پکڑ لیا اور کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ جب یہ رقم بھی خرچ ہو گئی تو سامنے بھوک اور مفلسی پھر دانت نکالے آن کھڑی ہوئی۔ چپکے سے ایک روز کا فاقہ آ گیا۔ بالی نے پران چھوڑ دیئے۔ زخمی ریچھنی کی طرح گھر میں غراتی پھرنے لگی۔ میں شام کو سیدھا پرسی کے پاس پہنچا۔ اس کو سارا دکھڑا سنایا۔ پانچ روپے قرض لئے اور ہوٹل سے کباب اور نان لے کر گھر آیا۔

گیلری میں آیا تو دروازے پر تالا پڑا تھا۔ چپ چاپ گیلری میں کھڑا ہو گیا۔ پھر سوچا بالی سوائے حنیفہ کے گھر کے اور کہیں نہیں ہو گی۔ سیدھا وہاں گیا۔ ان کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد بالی مسکراتی ہوئی باہر نکلی۔ میرے ہاتھ میں لفافہ دیکھ کر بولی:۔

اس میں کیا لائے ہو؟"

میں نے کہا:۔

"کباب لایا ہوں۔"

مکان کا تالا کھول کر ہم اندر آ گئے۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں چنگیر میں نان اور کباب رکھنے لگا۔ بالی نے دوپٹے کے پلو سے دس دس کے پانچ نوٹ کھول کر چنگیر میں رکھ دیئے۔

میں نے حیرانی سے پوچھا:۔

"یہ کہاں سے لائی ہو؟"

بالی نے منہ پھلا کر کہا:۔

"کہاں سے لاسکتی ہوں۔ اس تمہارے گھر کی عزت رکھنے کے لئے حنیفہ کی ماں سے قرض لیا ہے۔ اور کیا کیا ہے۔ آخر اس طرح کب تک گذر ہوگی؟"

میں نے کہا:۔

"بالی! یہ بات ٹھیک نہیں کی تو نے۔ اس عورت سے قرض نہیں لینا چاہیئے تھا اور پھر یہ قرض ادا کہاں سے ہوگا۔ کہیں سے ایک پیسے کی امید نہیں ہے۔"

بالی تنک کر بولی:۔

"تو کیا رسّی گلے میں ڈال کر مرجائیں۔ آخر مکان کا کرایہ، زیوروں کا سود کہاں سے ادا ہوگا؟ اور پھر حنیفہ کی ماں نے کہہ دیا ہے۔ ان روپوں کا فکر نہ کرنا جب پیسے ہوں گے دے دینا۔"

میں خاموش ہوگیا۔ مفلسی، غریبی، معاشی تنگ دستی اور بدحالی نے مجھے بزدل بنا دیا تھا اور بے بس کر رکھا تھا۔ بالی نے نوٹ اٹھا کر ٹرنک میں جا رکھے اور واپس آکر بولی:۔

"میں تو کہتی ہوں کسی طرح میرا زیور ساہوکار سے نکل آئے۔ ہر ماہ سود پڑ رہا ہے۔ اس حالت میں کیا امید ہوسکتی ہے کہ میرا زیور مجھے واپس مل جائے گا۔ زیور عورت کا سنگار ہوتا ہے میں تو ننگی بچی ہو کر بیٹھ گئی ہوں۔ آج ہی حنیفہ کی ماں پوچھ رہی تھی تیرے کنگن کدھر چلے گئے۔ میں نے کہا دھلانے بھیجے ہیں۔"

"یہاں زہر کھانے کو پیسہ نہیں زیور نکلوانے کی رقم کہاں سے آئے گی؟"

بالی نے کباب کھاتے ہوئے آہستہ سے کہا:۔

"اگر تم کہو تو حنیفہ کی ماں سے اور روپے قرض لے لوں۔ اس کے پاس ٹرنک میں میں نے سو سو کے کتنے ہی نوٹ دیکھے تھے۔ بڑی امیر عورت ہے۔"

میں نے سختی سے کہا:۔

"خبردار اگر اب اس سے قرض لیا۔ بالی! تم کو کیا ہوگیا ہے۔ مصیبت

سبھوں پر آتی ہے لیکن اس طرح حوصلہ تو نہیں ہارا کرتے۔ میں نے بڑا تنگ دستی کا زمانہ دیکھا ہے۔ مگر کبھی نہیں گھبرایا اور پھر زیور نہیں تو کیا ہوا جب روپے ہوں گے مل جائے گا۔ وہ تو امانت پڑی ہے۔

بالی کر ختگی سے بولی:۔

"مگر روپیہ کہاں سے آئے گا؟ پورے پونے چار سو کی رقم چاہیئے اتنا روپیہ کہاں سے آئے گا؟ میں تو اس وقت کو رو رہی ہوں جب میں نے تمہیں اپنی چیزیں پکڑا دی تھیں۔"

"تو کیا تم چاہتی ہو میں ذلیل ہو کر دربدر مارا مارا پھروں؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے؟"

"پھر کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"تم روٹی کھاؤ بس۔ تم سے اب کچھ نہیں ہو سکے گا۔ تم چوڑیاں ڈال کر گھر پر بیٹھو اور میں تمہاری جگہ کام کی تلاش میں نکلتی ہوں۔ خدا جانے کہاں دن بھر دوستوں کے ساتھ موج اڑاتے پھرتے ہو۔ شام کو آکر کہہ دیتے ہو نوکری نہیں ملی۔"

میں غصے میں کھانا وہیں چھوڑ کر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ گیلری میں مجھے بالی کی آواز سنائی پڑی۔

"جاتے ہو تو جاؤ۔ ہمارے بھی جہاں سینگ سمائیں گے جا رہیں گے۔"

رات گئے تک میں شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ میں قصداً پرسی کے پاس نہ آیا کیونکہ پریشانی کے وقت آدمی دوستوں کے پاس بیٹھ کر زیادہ پریشان ہو جاتا ہے دوست ہر بات کو کرید کرید کر پوچھتا ہے اور یوں دل کے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے ہیں۔ کوئی گیارہ بجے رات تھکا ماندہ گھر واپس آیا۔ بالی حسب معمول بن سنور کر پلنگ پر بیٹھی فلمی رسالہ سامنے رکھے اس کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر خوشی خوشی اٹھی اور میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ میں حیران رہ گیا۔ کچھ خوش بھی ہوا۔

"کیا بات ہوئی ہے؟"

بالی نے دراز میں سے سو سو کے چار نوٹ نکال کر میرے ہاتھ میں دیئے اور بولی:۔

"حنیفہ کی ماں نے میرے صرف ایک بار کہنے پر ہی مجھے قرض دے دیا۔ بولی تم زیور فوراً چھڑوا لو۔ یہ ساہوکار تو زیور ہضم کر جائیں گے۔ سچ بڑی اچھی عورت ہے۔ کہنے لگی بے شک ایک سال بعد میری رقم واپس کرنا۔ مجھے تم پر بے اعتباری نہیں۔"

میں تو ھونچکا کر رہ گیا۔ ایک مدت بعد سو سو کے نوٹ دیکھے تھے۔ دل بے حد خوش بھی ہوا۔ بوجھ سا اُتر گیا۔ روپے دیکھ کر زندگی کی ساری پریشانیاں دور ہو گئیں اور یوں لگا جیسے چاروں طرف خوب صورت چاندنی نکل آئی ہو۔ لیکن پھر جیسے اچانک حلق میں تلخی سی محسوس ہوئی۔ میں نے بالی سے کہا:۔

"آخر یہ عورت کیوں تمہیں قرض دے دیتی ہے؟"

بالی جھٹ بولی:۔

"تم تو خواہ مخواہ اس کی شرافت پر شک کر رہے ہو۔ ایک تو وہ ہماری مدد کر رہی ہے اور اوپر سے تم اسے بُرا سمجھنے لگے ہو۔ وہ ہماری سچی ہمدرد ہے۔ وہ ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔ وہ آسانی سے قرض دے سکتی ہے اس کے پاس تو ڈھیروں روپیہ ہے کپڑے کا کاروبار جو کرتی ہے۔"

دوسرے روز میں جا کر بالی کا زیور چھڑا لایا۔ بالی نے زیور دیکھا تو اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ اس روز اس نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے۔ خوب بناؤ سنگار کیا اور زیور پہن کر پلنگ پر رانی بن کر بیٹھ گئی۔ وہ بار بار آئینے میں اپنی سج دھج دیکھتی اور خوشی سے لہرا اٹھتی۔ اس نے مجھے بھی نئے کپڑے پہنا دیئے تھے، شام کو ہم سیر کرنے لارنس باغ گئے۔ واپسی پر ہم نے میکلوڈ روڈ کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور خوب سیر ہو کر چائے پی۔ بالی نے مجھے بھی سگریٹ کے دو پیکٹ لے

دیئے۔ ہم خوش خوش گھر واپس آئے۔ بالی۔ نے دروازہ بند کر کے سیلون لگایا۔ دوپٹہ اتار کر پرے پھینکا اور فلمی گانے کی دھن پر رقص کرنے لگی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے ایسا کرنے سے منع کروں یا اس کے رقص کا لطف اٹھاؤں کبھی دل میں آتا اسے روک دوں۔ کبھی جی چاہتا اس کے ساتھ تالی بجاؤں اور مسرت کا نعرہ لگا کر اسے دبوچ لوں۔ اپنے آپ پر مجھے اس وقت ایک انتہائی باغیرت آدمی اور ایک انتہائی بے غیرت انسان کا شبہ ہو رہا تھا۔ میرا سر بھاری اور دل ہلکا ہو رہا تھا۔ بالی۔ نے رقص کا ایک دائرہ پورا کیا اور میری آغوش میں آن گری۔ میں بے اختیار ہو کر اس سے لپٹ گیا

"ادئی! تم میری سرخی خراب کر رہے ہو۔"

باقی پچیس روپے تین دنوں میں ختم ہو گئے۔ ان تین دنوں میں روز گھر میں گوشت پکا اور دونوں وقت چائے ہوٹل سے آئی۔ چائے کے ساتھ پیسٹری بھی منگوائی گئی کیونکہ اب بالی کو پیسٹری کے بغیر چائے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ چوتھے روز پھر پیسے ختم ہو گئے۔ میں پریشان سا ہو کر قرض لینے کی نیت سے قریشی صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے بیان کے مطابق کاروبار ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ناامید و ناکام ہو کر شام کو گھر واپس آگیا۔ میرا خیال تھا کہ رات پھر کھانے کے بغیر گزرے گی کیونکہ گھر میں صرف دو آنے باقی رہ گئے تھے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بالی چولہے پر گوشت بھون رہی تھی اور بازار سے گرم گرم نان اور پیسٹری منگوا کر نعمت خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے خوش ہو کر حیرانی سے پوچھا

"یہ مال کہاں سے آگیا؟"

بالی مسکرا کر بولی:۔

"بس خدا نے دے دیا۔ جن لوگوں کو ہم سے ہمدردی ہے وہ ہمیں بھوکا تو نہیں دیکھ سکتے ناں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ میں نے کھول کر کچھ نہ پوچھا۔ میں اسے کریدتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ دل کے لئے اتنی تسلی ہی کافی تھی کہ بالی نے حنیفہ کی ماں سے مزید قرض لیا ہو گا

آخر پیٹ کے لئے ایندھن بھی توضروری تھا۔ پھر پورے گھر کی ساکھ قائم رکھنی تھی۔ اکیلا ہوتا تو کسی طرف منہ اُٹھا کر چل دیتا مگر بالی کو کہاں لئے پھرتا؟ پھر بھی میں نے اسے کہا:

"لیکن بالی! یہ اتنا سارا قرض ہم کیسے اور کہاں سے ادا کریں گے"!

بالی کہنے لگی:-

"تم غم کیوں کرتے ہو؟ سدا دن ایک سے نہیں رہتے اور پھر دنا مجھے قرض تھوڑی دے رہی ہے"!

حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"پھر یہ پیسے کہاں سے آ رہے ہیں؟ کس حساب میں آ رہے ہیں؟"

بالی نے چمچ سے بوٹی نکال کر اسے ہاتھ سے توڑتے ہوئے کہا:-

"اب تم سے کیا چوری ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ حنیفہ کی ماں نے مجھے اپنے کپڑے کے کام میں شامل کر لیا ہے۔ میرا کام صرف کپڑے کے کٹے ہوئے تھانوں کو پھر سے سینا اور انہیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کرنا ہے اس کام کی اجرت وہ مجھے ساتھ ہی دے دیتی ہے۔ کہنے لگی دو سو روپے ماہوار دوں گی۔ میں نے کہا پہلے کچھ پیشگی دے دو قرض بہت ہو گیا ہے زیور ساہوکار کے ہاں پھنسا ہوا ہے۔ سو اس بے چاری نے رقم دے دی۔ کہو اب تو شک دور ہوا"!

میں نے مسکرا کر کہا:-

"ارے واہ! پھر تو تم نے نوکری کر لی ہے۔ یوں کیوں نہیں کہتیں۔ چلو اچھا ہے۔ گھر کا خرچ تو آج کل میاں بیوی دونوں کام کریں تو چلتا ہے مگر بالی! اتنی تنخواہ وہ تمہیں کیسے دے گی؟"

"ارے اس کا دھندا بڑا چلتا ہے۔ وہ لنڈی کوتل سے کپڑا منگواتی ہے"!

اچانک مجھے ان لوگوں کا خیال آیا جو اس کے ہاں اکثر آتے جاتے تھے۔ بالی کہنے لگی:-

"آتے ہیں تو آتے رہیں۔ ہماری جوتی کو۔ ہمیں تو اپنے کام سے غرض ہے
اور پھر اکثر تو حنیفہ کی ماں کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔"
میری تسلی ہو گئی۔ بالی دن میں دو تین گھنٹے حنیفہ کے ہاں گزارنے لگی۔ میں کام کی تلاش میں باہر نکل آتا اور وہ کام کرنے حنیفہ کی ماں کے پاس چلی جاتی۔ بالی کے پاس بلکہ ہمارے پاس روپے کی کمی نہ رہتی۔ اکثر بالی حنیفہ کی ماں سے پیشگی لے آتی اور ہم اچھا کھانے پینے لگے۔ بالی کی صحت بڑی اچھی ہونے لگی۔ وہ پہلے سے بھاری ہو گئی تھی اور چہرے پر چمک آنے لگی تھی اس نے بڑے خوبصورت اور قیمتی کپڑے بھی بنوا لئے تھے وہ میرے لئے بھی اکثر قمیض اور پتلون کا کپڑا وہیں سے لے آتی۔ ایک بار اس نے دو گھوڑا بوسکی کی ایک قمیض مجھے لا کر دی۔ میں نے پہنی تو پرسی نے پوچھا:۔
"بیکاری میں بوسکی کہاں سے آ گئی۔"
میں نے اسے بالی کی ملازمت کے متعلق بتانا مناسب نہ سمجھا۔ بس اتنا کہہ کر ٹال دیا کہ بالی کے بھائی نے کویت سے کپڑا بھیجا تھا۔ اب بالی میں ایک اور تبدیلی رونما ہو رہی تھی یعنی اس نے سگریٹ پینا شروع کر دیئے تھے۔ ایک روز میری ڈبیا سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا:۔
"تم نے سگریٹ کب سے شروع کر دیئے؟"
"ابھی شروع کر رہی ہوں۔ سنا ہے سگریٹ پینے سے عورتوں کی عمر زیادہ لمبی ہو جاتی ہے۔"
وہ بظاہر کھانسنے لگی مگر اس کے پینے کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اکثر پیا کرتی ہے۔ میں خاموش ہو رہا۔ یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے میری عدم موجودگی میں میری ڈبیا میں سے یونہی شوقیہ طور پر پیا کرتی ہو۔ ایک رات میں بالی کے ساتھ لیٹا اس کا منہ چومنے لگا تو مجھے اس کے منہ سے شراب کی سی بو آئی۔ بالی کی آنکھیں بھی کچھ کچھ سرخ ہو رہی تھیں۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا:۔
"تم نے شراب پی رکھی ہے؟"

"نہیں تو ؟"

"جھوٹ بولتی ہو۔"

میں نے غصے سے بالی کی طرف دیکھا تو ہنس پڑی اور بولی :-

"جانی! میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ آج مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ ہوا یوں کہ حنیفہ کا ایک رشتے میں ماموں ہے۔ وہ شراب کا عادی ہے۔ جب وہ یہاں آتا تو شراب ساتھ لاتا اور چپکے سے کمرے میں اکیلا بیٹھ کر پیا کرتا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے اسے کہہ رکھا ہے اگر اس نے شراب چھوڑ دی تو اسے دمہ ہوجائے گا۔ آج جو میں کام پر گئی تو مجھے پیاس لگی۔ ایک گلاس میز پر پڑا تھا۔ میں نے کہا اس میں کیا ہے۔ حنیفہ کی ماں نے کہا پانی ہوگا۔ وہ بالکل سفید تھی۔ میں پی گئی۔ فوراً مجھے قے ہوگئی۔ حنیفہ کی ماں کو تو فکر پڑ گئی۔ معلوم ہوا کہ غلطی سے شراب کا گلاس وہاں رہ گیا تھا۔ بے چاری نے اسی وقت اسپرو منگوائی میرا سر دبایا اور پھر کہیں جا کر مجھے آرام آیا مگر سر ابھی تک بوجھل ہو رہا ہے۔"

مجھے بالی کی رام کہانی پر یقین آگیا۔ ایسی غلطی اس قسم کے گھر میں ہوسکتی ہے۔ میں پھر بالی سے پیار و محبت کرنے لگا۔ لیکن بالی کے پیار کرنے کا انداز کچھ مختلف ہو رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ شدت اور مہارت کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر منہ چوم رہی تھی۔ یہ بیوی کا پیار نہیں تھا بلکہ کسی معشوقہ کا پیار معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اس تبدیلی کا اظہار کیا تو بالی نے کہا کہ وہ بالکل پہلے کی طرح مجھ سے محبت کرنے لگی ہے اور مجھے اپنا خاوند کم اور محبوب زیادہ سمجھتی ہے۔ میں بالی کی اس شہد آگیں کایا پلٹ پر دل ہی دل میں بے حد خوش ہوا اور اپنی نگاہوں میں خود کو کسی فلم کا ہیرو تصور کرنے لگا۔

عید آگئی۔ مجھے ظاہر ہے کام کہیں نہیں ملا تھا۔ میں لاہور سے باہر جانے پر تیار ہوتا تو بالی باہر جانے سے انکار کر دیتی۔ باہر کام مل رہا تھا۔ لاہور میں کام کا ملنا مشکل نظر آ رہا تھا وعدے سب لوگوں نے کر رکھے تھے۔ لیکن جگہ کہیں بھی خالی نہیں ہو رہی تھی۔ سچ

بات تو یہ تھی کہ جب سے بالی کو نوکری ملی تھی میں بھی کچھ کم چور اور سست ہو گیا تھا۔ کام کی تلاش میں وہ تندہی اور سرگرمی نہ دکھاتا تھا۔ اب سارا خرچ بالی نے اٹھا رکھا تھا عید آگئی۔ بالی نے میرے اور اپنے کپڑے بنائے۔ مجھے دس روپے الگ جیب خرچ دیئے مجھے اس سے پیسے لیتے شرم بھی آتی۔ پھر سوچتا آخر میری بیوی کی حلال کی کمائی ہے اور پھر میں کوئی ساری عمر بیکار تھوڑی رہوں گا۔ آج نہیں تو کل کام مل جائے گا۔ پھر گھر کا دھندا مجھے ہی چلانا ہے۔ پھر بھلا میں بالی کو نوکری کرنے دوں گا۔ سارا دن ہم شہر کی تفریح گاہوں میں سیر سپاٹے کرتے پھرے۔ شام کو گھر آگئے۔ بالی نے کہا کہ حنیفہ کی ماں نے اسے بلا بھیجا ہے وہ وہاں چلی گئی اور میں پڑوسی کے ساتھ گھومنے پھرنے چل دیا۔ رات کو واپس گھر آیا تو مکان پر تالا پڑا تھا۔ میں نے سوچا بالی ابھی تک حنیفہ کی ماں کے ہاں سے واپس نہیں آئی۔ کام زیادہ ہوگا۔ چلو اس سے چابی لے آؤں۔ میں حنیفہ کی ماں کے کمرے کے باہر دستک دینے لگا۔ دیکھا وہاں بھی تالا پڑا ہے۔

سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ فکر بھی لاحق ہوا۔ پھر خیال آیا شاید کہیں دونوں بازار چلی گئی ہوں۔ لیکن اتنی رات گئے تو انہیں واپس آجانا چاہیئے تھا۔ اب جو میں نے پرلی طرف گیلری میں جا کر دیکھا تو اندر کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ میرے دل نے کہا دیکھو تو اندر کون ہے۔ گھر پر کوئی نہیں پھر بھی بتی کیوں جل رہی ہے؟ کہیں اندر چور تو نہیں گھس آئے۔ روشندان تک چڑھنے کے لئے وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے دوسری گیلری میں جا کر سفیدی کروانے والی پرانی سیڑھی اٹھائی اور دروازے کے ساتھ لگا دی اور پر چڑھ کر میں نے روشندان سے اندر جھانک کر دیکھا۔

پہلی نظر دیکھنے سے میرا سر چکرا سا گیا۔ نگاہ اچٹ گئی اور آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے آنکھوں کو اچھی طرح ہاتھوں سے ملا اور پھر اندر جھانک کر دیکھا۔ اف خدایا! میں ششدر رہ گیا۔ میری کنپٹیوں پر ہتھوڑے بجنے لگے۔ سیڑھی پر میری ٹانگیں برف کی طرح سرد ہو گئیں۔ پھر یک بارگی میرا خون کھول اٹھا اور میں نے ایک ہی زوردار مکے سے روشندان کا شیشہ توڑ دیا۔ تینوں برہنہ مردوں اور اکیلی برہنہ میری بیوی بالی نے چونک کر

روشندان کی طرف دیکھا۔ شراب کی بوتلیں میز پر سے لڑھک گئیں۔ میں نے چیخ مار کر بالی کو لیکارا اور مردوں کو گالیاں بکنا شروع کر دیں۔

اندر ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ مردوں نے جلدی جلدی کپڑے اٹھائے اور پردہ اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف بھاگ گئے۔ بالی منہ چھپا کر میز کے پاس چھپ کر بیٹھ گئی۔ میں نے ہاتھ اندر ڈال کر دروازے کی کنڈی کھولی۔ سیڑھی پر سے اندر کود گیا۔ اندر جاتے ہی میں نے پاگل ہو کر بالی کو دونوں ہاتھوں سے مارنا شروع کر دیا۔ اس نے بھاگ کر دروازہ بند کر دیا اور میرے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ دوسرے کمرے سے وہ شرابی بھی نکل آئے انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں پکڑ کر پلنگ پر ڈال دیا۔ بالی کپڑے پہن کر باہر فرار ہو گئی۔ میں زخمی شیر کی طرح پلنگ پر سے دھاڑتا ہوا اٹھا اور بالی کی تلاش میں اس کے پیچھے بھاگا۔ میں نے اسے سبحان بلڈنگ کی سیڑھیوں میں جا لیا۔

"اوپر چلو"

"معاف کر دو۔ خدا کے لئے معاف کر دو"

"تمہاری ماں کا ...... تمہاری بہن کا ...... اوپر چلو بالی۔ اوپر چلو"

ہم دونوں کے سانس پھولے ہوئے تھے۔ ساری بلڈنگ کے دروازوں میں عورتیں نمودار ہو گئی تھیں مگر میں غصے اور غیرت میں اندھا ہو رہا تھا۔ مجھے سوائے بالی کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔

"جاتی ہوں۔ خدا کے لئے جاتی ہوں ......"

وہ اوپر چڑھنے لگی۔ مکان کے باہر آ کر اس نے ازار بند میں سے کانپتی انگلیوں سے چابی نکال کر تالا کھولا۔ میں نے اسے دھکا دے کر اندر گرا دیا اور دروازہ بند کر لیا اس کے بعد بلڈنگ والوں نے صرف میری للکاریں، بالی کی چیخیں اور گھونسوں لاتوں کی آوازیں ہی سنی ہوں گی۔ عورتیں دروازہ پیٹنے لگیں۔

"کیوں اس کی جان لے رہے ہو۔ تم بھی پھانسی چڑھ جاؤ گے جانی۔ اب اسے بخش دو"

تین دن تک۔ بالی بستر پر سوجے ہوئے اعضا اور دکھتا ہوا بخار آلود جسم لئے پڑی رہی میں نے حکیم سے اس کا علاج کروایا۔ ہفتے بعد وہ تندرست ہوگئی۔ میں نے اس سے بول چال بند کر رکھی تھی۔ میں باہر تالا لگا کر جاتا۔ بالی کو کمرے میں بند کر دیا تھا اسے ایک قدم باہر نکالنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں محلے میں شام کو منہ چھپا کر نکلتا۔ میری ہر طرف بے عزتی ہو رہی تھی۔ ساری بلڈنگ والوں کو پتہ چل گیا تھا کہ بالی غیر مردوں کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ بالی ہر وقت منہ لپیٹ کر پڑی رہتی۔ وہ بے دلی سے کھانا بناتی۔ میرے آگے رکھ کر دوسری طرف ہو کر بیٹھ رہتی۔ مجھے ہمیشہ قہر آلود نگاہوں سے دیکھتی۔ کبھی التجا نہ کرتی کہ میں اسے آزاد کردوں اور تالا لگا کر باہر نہ جایا کروں۔ میرا دماغ پھنا گیا تھا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے گوجرانوالہ میں نوکری کی کوشش کی۔ ایک دوست نے خط لکھ کر وہاں بلالیا کہ نوکری مل جائے گی چلے آؤ۔ میں نے ڈاک خانے میں جا کر اسے تار دی کہ صبح گوجرانوالہ پہنچ رہا ہوں صبح سے نکلا ہوا تھا اور اب شام ہوگئی تھی۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف چل پڑا۔ اس خیال سے کہ سامان وغیرہ باندھ رکھوں۔ تاکہ صبح پہلی بس سے یہاں سے کوچ کیا جائے۔ پرسی سے میں نے بیس روپے کسی نہ کسی طرح قرض لے لئے تھے۔ سبحان منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر جب میں اوپر گیلری میں آیا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا میں اندر گھس گیا۔ اندر سوائے فرنیچر کے اور کچھ نہ تھا۔ بالی غائب ہو چکی تھی اور ساتھ ہی اپنا سارا سامان، کپڑے گہنے سب کچھ لے گئی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر لیا اور سر پکڑ کر ایک چوکی پر بیٹھ گیا۔

کمرے یوں ویران ہو رہے تھے جیسے وہاں سے بھینسوں کا ریوڑ ہر شے کو لتاڑتا ہوا گزر گیا ہو۔ دیواروں پر لگی ہوئی ایکٹرسوں کی تصویریں بھی غائب تھیں۔ بالی چلی گئی تھی۔ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھی۔ اب یہ مکان۔ یہ خالی مکان اور ویران سامان میرے کس کام کا تھا؟ میں نے رات جاگ کر، چکر لگا کر، سر ہاتھوں میں چھپا کر روتے روتے کاٹ دی۔ صبح پرسی کے نام ایک پرچہ لکھ کر اس کی کوٹھڑی میں ڈال دیا جس میں لکھا کہ میں مکان کی چابی اور سامان تمہیں دیئے جا رہا ہوں۔ چابی مالک مکان کو دے دینا!

اور سامان بیچ کر اپنا اور قریشی صاحب کا جو مجھ پر قرض ہے وہ ادا کر دینا میں جا رہا ہوں۔ کہاں ؟ یہ میں بھی نہیں جانتا۔ میں وہاں سے سیدھا اسٹیشن پر آگیا۔ میری جیب میں صرف تین روپے دس آنے تھے۔ میں نے کسی نامعلوم طرف کا ٹکٹ خریدا۔ سٹیشن کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو کر لاہور پر اس سنگدل خوبصورت شہر پہ آخری نظر ڈالی اور گیٹ میں سے گزر کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو گئی۔ میں نے سر باہر نکال کر باہر دیکھا میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا۔ میں ہتھیلی سے آنکھیں ملنے لگا۔ رونے لگا۔

⁂ ⁂ ⁂



اے حمید
سورج نہیں نکلا
اے حمید
پھر بہار آئی
اے حمید
ویران جزیرے
اے حمید
برف باری کی رات
اے حمید
سورج کا داغ
اے حمید
سیاہ پھول
اے حمید
میرا دوست میرا دشمن
اے حمید
بادبان کھول دو